اترپردیش اردواکادمی
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी

خبرنامہ

ماہنامہ اُترپردیش اُردو اکادمی لکھنؤ

اپریل ۲۰۲۳ء

आज़ादी का अमृत महोत्सव

اتر پردیش اردو اکادمی

خبرنامہ

جلد : ۵۱ اپریل ۲۰۲۳ء شمارہ : ۱۰

سرپرست : چودھری کیف الوریٰ (چیئرمین)

ایڈیٹر : ایس۔مناظر عادل حسن

معاون : محمد معاذ اختر احسن (سپرنٹنڈنٹ)

زرسالانہ : پچاس روپے -/50

قیمت فی شمارہ : پانچ روپے -/5

upurduakademi3@gmail.com

www.upurduakademiin

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ

سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ،

گومتی نگر لکھنؤ- 226010

فون نمبر: 0522-4022 924

ایس۔مناظر عادل حسن، ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر نے امپریشن پرنٹ ہاؤس، لاٹوش روڈ، لکھنؤ سے چھپوا کر دفتر اکادمی، واقع وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ سے شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ	ایڈیٹر	۲
اردو ادب میں کربلائی عناصر	ڈاکٹر محمد مستمر	۳
غزل	سلطان کلیم سنبھلی	۱۰
غزل	اشتیاق علی صباؔ	۱۰
جگر کا جگر پھٹ گیا	ندیم راعی	۱۱
غزل	جمیل احمد جمیلؔ	۱۶
غزل	شریف قریشیؔ	۱۶
لکشمی نارائن فارغؔ:	شاہد پٹھان	۱۷
غزل	ضیاؔ کاملی	۲۶
غزل	قمرؔ خیر آبادی	۲۶
امانت اللہ اسیرؔ کی شاعری	محمد الیاس تائبؔ	۲۷

•••

اداریہ

واقعات سے وقت کی شناخت ہوتی ہے، عظیم شخصیتیں اور افراد واقعات کی پہچان کا سبب ہوتے ہیں۔ اپریل کا مہینہ آتے ہی جلیاں والے باغ کے دل سوز واقعہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جلیاں والا باغ میں ہزاروں نہتے ہندوستانیوں پر بے تحاشہ گولیاں برسائی گئیں۔ ۱۹۱۹ء میں اپریل کا یہ مہینہ تاریخ کا یادگار اور ہماری جدوجہد آزادی کا ایک ایسا عنوان بن گیا جس میں خون کی سرخی اور چمک دمک موجود ہے۔ ہم اپنے ان شہیدوں کو سلام کرتے ہیں اور آزاد ہندوستان کے کروڑوں عوام ان شہیدوں کی یاد مناتے ہوئے جدوجہد آزادی کی تاریخ کو ایک پہچان عطا کرتے ہیں۔ ہماری یکجہتی کی کہانی اور ہمارے اندر قربانی دینے کی تمنا اور تڑپ اس واقعہ سے ہر برس تازہ ہوتی رہتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ لالہ لاجپت رائے، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ست پال کے نام تاریخ کے صفحات میں ملتے ہیں۔ ہم جلیاں والا باغ کے شہیدوں کو خراج عقیدت کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

اسی ماہ میں ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر ۱۴/اپریل کو پیدا ہوئے۔ وہ ہمارے آئین کے معماروں میں تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے پسماندہ اور پچھڑے ہوئے لوگوں کو ایک نیا ولولہ اور نیا حوصلہ دیا تھا۔ اپنی نظریاتی جدوجہد سے آج وہ ایک علامت اختیار کر گئے ہیں، ان کے یوم پیدائش پر انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے، ان کی یاد مناتے ہوئے ہمارا فریضہ ہے کہ ان کی شخصیت، ان کے افکار اور اصولوں پر کاربند ہو کر سماج کے سبھی طبقوں میں بیداری لانے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ جمہوری ماحول میں خوشگوار زندگی گذار سکیں۔

اردو کے بزرگ صحافی اختر یونس قدوائی کا گذشتہ ماہ ۲۳/ مارچ کو انتقال ہو گیا۔ مرحوم ۱۹۲۷ء میں بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے لکھنؤ کے امیر الدولہ اسلامیہ کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا، لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۴۷ء میں گریجویشن اور ۱۹۵۰ء میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ صحافت کی شروعات روزنامہ ’ہمدم‘ سے کی جو فرنگی محل سے شائع ہوتا تھا۔ کچھ دنوں تک تنویر پریس میں اس کے بعد ۱۹۵۱ء میں کانپور سے شائع ہونے والے روزنامہ ’سیاست‘ سے وابستہ ہوئے۔ پھر ۱۹۷۰ء سے روزنامہ ’قومی آواز‘ میں رٹائرمنٹ تک اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ یونس قدوائی ایک بے باک صحافی تھے۔ اردو کی صحافتی تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ مرحوم گذشتہ ۲۵ برسوں سے روزنامہ ’صحافت‘ سے وابستہ تھے۔ زندگی کے آخری ایام تک وہ لکھتے پڑھتے رہے۔ اردو اکادمی ان کی وفات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے انہیں خراج عقیدت پیش کرتی ہے۔

ایس۔ مناظر عادل حسن
ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد مستمر
اسسٹنٹ پروفیسر، ذاکر حسین دہلی کالج، نئی دہلی
Mob. 89208 60709

اردو ادب میں کربلائی عناصر

بات جب ہم 'لفظِ کربلا' کی کرتے ہیں تو ہمارا ذہن فوراً واقعاتِ کربلا کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور وہ سارے کردار جن کی تعداد بہتر ہے، ایک ایک کر کے ہماری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ تاریخ کے حوالے سے بھی اور شاعری کے دریچوں سے بھی۔ لیکن یہاں سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ کیا صرف ''ساحل سے سر ٹپکتی تھیں موجیں فرات کی'' روداد کا نام ہی میدانِ کربلا ہے یا ''پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی'' کا نام ہی واقعاتِ کربلا ہے؟ یا اس سے پہلے کی جنگیں جو نبی کریمؐ کے دور میں ہوئیں اس میں کربلائی عناصر نہیں ہیں؟ دل اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے صحابۂ کرام کے واقعات تاریخ کے صفحات پر بکھرے پڑے ہیں، جس میں 'کرب' بھی ہے اور 'بلا' بھی --- اور انہی دو لفظوں کا مرکب ہے کربلا جس میں واوحرفِ عطف کو حذف کر کے 'کربلا' وجود میں لایا گیا جو بطور استعارہ اردو شاعری میں کثرت سے استعمال ہوتا آ رہا ہے۔ درحقیقت یہ استعارہ 'ظلم و جبر' کا استعارہ ہے۔ کرب اور بلا کی چیخیں اور آہیں حضرت آدم سے لے کر دورِ حاضر تک حلول بھی ہیں اور منتشر بھی۔ ایسے ایسے دل دوز اور روح کو مجروح کر دینے والے واقعات رونما ہوئے ہیں کہ جن کو اگر ایک جگہ ترتیب دیا جائے تو کئی ضخیم کتابیں وجود میں آ سکتی ہیں۔ ان کربلائی واقعات کو ہر دور اور ہر زبان کے شاعر نے اپنے شعروں میں پیش کیا ہے۔ ہندی اور سنسکرت میں 'کرون رس' کا جنم ایسے ہی واقعات کا مرہونِ منت ہے۔ جس کو کربلا کا مترادف بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

خون ریزی اور جہالت کا سب سے پہلا واقعہ روئے زمین پر ہابیل اور قابیل کا ہے۔ قابیل اپنے بھائی ہابیل کا قتل کر دیتا ہے۔ کیا ہابیل کی بیوی کے لئے یہ سانحہ کربلائی نہیں تھا؟ جس کا ذکر سورہ مائدہ کی آیت نمبر 27 میں بھی آیا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کربلائی عناصر دنیا کی تاریخ میں بکھرے پڑے ہیں اور جیسا کہ میں نے اوپر ذکر بھی کیا ہے کہ اس پر ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ جن لوگوں نے تاریخی ناول یا تاریخی تحریریں رقم کی ہیں انھوں نے کربلائی عناصر کو اپنے فکشن اور مضامین میں پیش کیا ہے --- اور اس دل دوز، کرب و درد اور رقت انگیزی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ دل رونے لگتا ہے اور آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ ایسی تحریروں کے باعث ہی علامہ راشد الخیری 'مصورِ غم' کہلائے۔

جس طرح تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے میں تو کہتا ہوں کہ اسی طرح تاریخ کے ساتھ کربلائی عناصر بھی اپنے آپ کو ہمیشہ دہراتے رہتے ہیں۔ تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہر صدی کے ہر عشرے کا اپنا ایک کربلائی باب ہے۔ 1857 کے دور کو تاریخ میں ہر نوعیت سے 'نشاۃ الثانیہ' کے دور سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس میں

صداقت بھی ہے۔ چنانچہ 1857 کے بعد کا دور سیاسی، سماجی، ادبی، معاشی اور تعلیمی ہر اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔

اگر ہم ادب کی بات کریں تو دنیا کے تمام ادب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے اور زبان و ادب کو بھی نئے نقطۂ نگاہ اور زاویے سے دیکھا اور پرکھا جانے لگا۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں سے شاعری کو ایک نئی نہج وسمت و رفتار عطا ہوئی اور فکشن کو بھی نئے پنکھ عطا ہوئے۔ نیز ادب کو حقیقی چولا ملبوس کرایا جانے لگا۔ کئی تحریکوں نے اس جانب خصوصی توجہ دیں۔ جس میں علی گڑھ تحریک اور ترقی پسند تحریک کو خاص امتیاز حاصل ہے۔

آزادی سے متعلق جو ادب تخلیق کیا گیا خواہ وہ فکشن کے حوالے سے ہو یا شاعری کے، اس میں آپ کربلائی عناصر پوری شدت کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں، کیونکہ آزادی کا دور چاہے وہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ تھا یا پھر دوسرے ممالک کا۔ سب جگہ، سب جگہ کی عوام آلام ومصائب سے دوچار چار تھی۔ ظلم و جبر کی آندھی تھی، مصیبتوں اور سختیوں کے سیلاب میں جمہور غرق اور تہ و بالا تھی۔ چنانچہ آزادی کا پورا دور ایک کربلائی عہد تھا۔ اس زمانے میں فکشن بھی لکھا گیا اور شاعری بھی کی گئی۔ بالخصوص نظموں کے ذریعے قوم کی بحرانی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ کال مارکس کے نظریات بھی حلول ہوگئے۔ گو وہ عناصر بھی ضم ہوئے جس کو 'زندانی ادب' کے نام سے جانا گیا۔ زندانی ادب آخر کیا ہے؟ جس میں آہیں، چیخیں، بکائیں اور سوز و درد کی کیفیت موجزن ہیں۔ جو انسان کے کربلا کی نمائندگی اور ترجمانی کرتا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ ہر صدی کا اپنا ایک کربلائی باب ہے بلکہ کئی کئی کربلائی باب ہیں، جس کی مثال بالکل ہمارے سامنے سینہ تانے کھڑی ہے۔ آزادی کی جدوجہد کے 47 برس، فسادات، تقسیم، قضیۂ بابری مسجد، ایمرجنسی، 84 کے سکھ فسادات اور صدی تک ختم ہوتے ہوتے شہادتِ بابری مسجد، پنجاب کا آتنکواد، مسئلہ کشمیر وکشمیری پنڈت اور صدی کے آغاز میں گجرات کا سب سے بڑا سانحہ۔ یہ تو وہ پہلو ہیں جو اندرون ہند کے پہلو یا گربھ سے پھوٹے ہیں۔ عالمی سطح کی اگر بات کریں تو ہمارے سامنے روس، لبنان، افغانستان، عراق، ایران، کویت، فلسطین، بنگلہ دیش، برما وغیرہ ممالک کو اپنے سیاسی مفاد کی وجہ سے سیاسی لیڈروں نے میدانِ کربلا بنادیا ہے اور ابھی حال فی الحال یوکرین کا کربلائی منظرنامہ اور کورونا کی وبا۔ جہاں صرف چیخیں ہی چیخیں ہیں۔ ایک ماتم ہے، سینہ کوبی، دلدوز آہ و بکا ہے۔ چنانچہ ان تمام مسائل اور کربلائی پہلوؤں کو ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے اپنے ادب میں جذب کرلیا ہے۔ جو ہماری تاریخ بھی ہے اور ادب بھی۔ چنانچہ سچا ادیب و ادب وہی ہے جو سماج کی نمائندگی کرے اور اس کے حواس خمسہ ہمہ وقت، ہمہ تن گوش رہیں۔ بلکہ فنکار کی تو چھٹی حس بھی برابر کام کرتی ہے۔ تبھی تو وہ اپنے فن کے ذریعے عوام کو بیدار بھی کرتا ہے اور مشتعل بھی۔

رثائی شاعری میں تو کربلا اپنی آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے تو اس فن کو جلا ہی نہیں بخشی بلکہ اسے بامِ عروج تک پہنچایا ہے۔ مرثیہ کا فن پہلا مرثیہ گو اشرف بیابانی اور شمالی ہند کا پہلا مرثیہ نگار روشن علی سہارنپوری سے ہوتا ہوا جوش ملیح آبادی جیسے جدت پسند اور مجتہد مرثیہ نگاروں تک پہنچتا ہے۔ میرے نزدیک ہر وہ کلام، ہر وہ تحریر جس میں آہ و بکا ہے، چیخیں ہیں، ماتم ہے، سینہ کوبی ہے، ظلم و جبر کی داستان ہے، کربلائی ادب کے زمرے میں شامل کیا جانا چاہیے۔ جنگِ آزادی کے تعلق سے جو نظمیں وجود میں آئیں، ان میں بلاشبہ کربلائی عناصر موجزن

ہیں۔اگر آپ کربلا کے لفظ کو مختص کرتے ہیں 'حسینی جماعت' سے تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ ''اردو ادب میں کربلائی عناصر'' موضوع پر گفتگو کی دوسری شکل ہوگی۔شکستِ زنداں کا خواب، ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام، اے نوع بشر جاگ! اور مفلس، یہ جوش ملیح آبادی کی ایسی ہی نظمیں ہیں جن میں اندرونی کرب و درد پورے طور پر دکھائی دیتا ہے۔مشتے نمونہ ازخروارے ۔

لب پہ خشکی، رخ پہ زردی، آنکھ شرمائی ہوئی
چشم و ابرو میں خودی کی آگ کجلائی ہوئی
(مفلس)

کیا ان کو کو خبر تھی زیروزبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو
اُبلیں گے زمیں سے مارِ سیہ، برسیں گی فلک سے شمشیریں
(شکستِ زنداں کا خواب)

جوش کے ساتھ ہی ایک پوری کہکشاں نظم کے میدان میں نظر آتی ہے۔محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، سلیم پانی پتی، ظفر علی خاں، سرور جہاں آبادی، چکبست لکھنوی، تلوک چند محروم، علامہ اقبال، بسمل عظیم آبادی، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض، جاں نثار اختر، مخدوم محی الدین، ساحرلدھیانوی، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی وغیرہ۔ بالخصوص ترقی پسند تحریک کا تو ہر شاعر اس جذبے سے مبرا نہ رہ سکا۔ان تمام شعراء نے انگریزوں کی طرف سے ہندوستانیوں پر ہونے والی زیادتیوں اور ظلم وستم کو اپنی نظموں کا حصہ بنایا۔ان نظموں میں ہندوستانیوں کے کرب کی بھی عکاسی ہے اور ظلم کے خلاف احتجاج و بغاوت کا اعلان بھی ہے۔اگر چہ انگریزوں کے ظلم و جبر کو بیسویں صدی کے شعراء نے شدت سے محسوس کیا مگر ایسا بھی نہیں کے ہندوستانیوں کے درد کا احساس انیسویں صدی کے شعراء کو بالکل نہ تھا۔ غالب جیسا شاعر جو انگریزوں کا وظیفہ خوار ہونے کے باوجود بھی اپنے ضمیر کی آواز کو وہ بھی نہ روک سکا تھا۔غالب کا قطعہ اس سلسلے میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔اس لئے یہاں قطعے کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں ۔

چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ، زنداں کا
شہرِ دلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنۂ خوں ہے، ہر مسلماں کا
میں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا
وہ ہی رونا تن و دل و جاں کا

غالب کے علاوہ اس وقت کے لگ بھگ سبھی شاعروں نے اس کرب کو برملا نہیں تو زیریں لہروں کے ساتھ کسی نہ کسی صنف کی شکل میں پیش کیا ہے۔لارڈ کرزن جو بنگال کا گورنر تھا، اس نے جس شدت اور اشتعال انگیزی کے ساتھ ظلم و جبر وستم کے پہاڑ توڑے اس سے ہر سو تراہی تراہی مچ گئی تھی۔درگا سہائے سرور نے اپنی نظم 'بدنصیب بنگال' میں اس کرب ناک اور ہولناک منظر کو بہت فن کاری اور جاں سوزی کے ساتھ متشکل و مرتسم کیا ہے۔مثلاً ۔

آہ اے محنت کش و حرماں نصیب و درد مند
آہ اے برگشتہ ایام و پریشاں روزگار

کرب کی زیریں لہر کے تعلق سے بسمل الٰہ آبادی کا یہ شعر بھی دیکھیں ۔

دل سے نکلے لب تک آئے لب سے پہنچے عرش تک
دل ہی دل میں جو رہے گھٹ کر آہ، آہ دل نہیں

فیض ایک ایسا شاعر ہے جس نے دورِ آزادی اور آزادی کے بعد کے دور کے کرب و درد کو جس آہنگ اور رنگ کے ساتھ اپنی نظموں میں پیش کیا ہے وہ انھی کا ملکہ ہے۔فیض کے کرب و درد میں احتجاج بھی ہے اور رومانیت بھی اور ان دونوں کے امتزاج سے فیض پسماندہ طبقے کا بھی شاعر ہے اور نوجواں طبقے کا بھی۔مگر

جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ ان کی شاعری میں قدم قدم پر کرب کی لہر جو گہرے سمندر کی طرح دور تک چلتی رہتی ہے، رومانیت پر غالب آجاتی ہے۔ چنانچہ مکروب طبقے کو فیض سے ہمدردی ہوتی چلی جاتی ہے اور مکرِّب فیض کو اپنا دشمن گردانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیض کو جیل خانے کی زندگی کا کرب جھیلنا پڑا اور فیض مکروب سے ہمدردی اور مکرِّب کو چیلنج کرتے رہے۔ ''ہم پرورش لوح وقلم کرتے رہیں گے'' یا پھر ''لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے'' ۔اس طرح کے فنی اوصاف آپ فیض کی بہت سی نظموں میں دیکھیں گے۔ مثلاً صبحِ آزادی، لوح وقلم، ویبقی وجہُ ربک (ہم دیکھیں گے)، نثار میں تیری گلیوں کے، آج بازار میں پابہ جولاں چلو، درد آئے گا دبے پاؤں، شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، وغیرہ ایسی ہی کرب انگیز اور درد سے سرشار ولبریز نظمیں ہیں۔ جن میں کربلائی عناصر جا بجا ضم ہیں۔ یا پھر اقبال کو لے لیجئے۔ نظم تصویرِ درد، میں لفظ درد، ہی اس بات کا غماز وضامن ہے کہ اقبال درحقیقت اپنے عہد کے منظر نامے کو بڑی رقت انگیزی کے ساتھ ایک ایک بند بلکہ ایک شعر میں پیش کرتے ہیں۔ اس نظم میں وہی کربلائی منظر نامہ یا باب ہے جس کرب سے اُس دور میں قوم دوچار تھی۔ اپنی نظم 'تصویرِ درد' میں کربِ قوم کو بھی بیان کرتے ہیں اور ضمیرِ قوم کو بیدار بھی کرتے ہیں مثلاً۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

ساحر لدھیانوی بھی اپنی نظموں میں سماج ومعاشرے کے کرب ودرد اور درونِ جسم میں پنپتے ناسور، تکالیف اور پریشانی کو اپنی نظموں میں دردانگیزی اور رقت انگیزی کے ساتھ جذب کر دیتے ہیں۔ قاری ان نظموں کو پڑھ کر محسوس کرتا ہے کہ یہ ان کا اپنا کرب ہے، اپنا درد ہے۔ ساحر اپنے دور کے کرب، افراتفری، مظالم اور بدعنوانیوں کو اپنے رنگ وآہنگ میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان کی نظمیں آفاقی نوعیت اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ محلوں یہ تختوں یہ تاجوں کی دنیا، لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں، ۲۶ر جنوری، بنگال، پھر وہی کنجِ قفس، وغیرہ اسی نوع کی نظمیں۔ جہاں آہ وبکا ہے، ماتم ہے، اندرونی کرب ہے، تشنہ لبی ہے، اشتہا ہے، بھوک اور افلاس ہے۔ مثلاً وہ اپنی نظم 'بنگال' میں اندرونی کرب ودرد کے ساتھ استفہامیہ کیفیت بھی پیدا کر دیتے ہیں جس کے باعث کربلائی عناصر مزید طاقت ور ہو جاتے ہیں۔

جہانِ کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو!
نظامِ نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں
یہ شاہ راہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان پہ دیس کی جنتا سسک سسک کر مرے
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اُگلا تھا
کہ نسلِ آدم و حوا بلک بلک کر مرے
مِلیں اسی لئے ریشم کے ڈھیر بُنتی ہیں
کہ دُخترانِ وطن تار تار کو ترسیں

علی سردار جعفری بھی ساحر قبیلے کے ہی ایک نڈر اور مکروب شاعر ہیں جو دبے کچلے، مظلوم ومحکوم، معتوب ومعصوم لوگوں کی وکالت کرتے ہیں۔ ان کی آہ وبکا کو اپنی فغاں سمجھتے ہیں۔ کرب کی زیریں امواج ان کے لئے تشویش کا باعث ہی ہوتی ہیں اور انھیں ایک نفسیاتی بحران میں بھی مبتلا رکھتی ہیں۔ وہ مظلوموں اور محکوموں پر ہونے والے مظالم کو دیکھ کر کراہ اُٹھتے ہیں۔ ان کی

نظموں میں بھی آپ کربلائی اثرات، استعارات اور احساسات و جذبات کو بہ خوبی دیکھ اور پڑھ سکتے ہیں۔ نیز سردار جعفری کے درد کو اپنے اور دردِ جہاں میں شامل کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ سردار جعفری کے درد کا آہنگ اور نقارخانہ قوم کے درد کا نوحہ ہے۔ ان کے اندر کا کربلائی عزم و استقلال انھیں سرخم ہونے اور گھٹنے ٹیکنے نہیں دیتا۔ نوالا، فریب، قتلِ آفتاب، حرفِ آخر، تخلیق کا کرب، ایک سوال، پیاس کی آگ، شعور، اب بھی روشن ہیں، پیراہن شرر، انفرادیت، دو چراغ، لہو پکارتا ہے، وغیرہ نظمیں ہمیں اندر تک ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ چنانچہ ہمارے لئے ضربِ کلیمی اور ترغیب کا کام کرتی ہیں۔ سردار جعفری نے آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کا دور، دونوں کو دیکھا، مجاہد تھے، جیل بھی گئے۔ آزادی کے بعد کے منظر نامے سے وہ مطمئن نہیں تھے۔ مثلاً اپنی نظم 'اب بھی روشن ہیں' میں کرب و بلا اور درد و الم کو یوں صفحۂ قرطاس پر مرتسم کرتے ہیں۔

اور پھر شاخوں سے تلواریں برس پڑتی ہیں
جبر جاگ اٹھتا ہے سفا کی جواں ہوتی ہے
سائے جو سبز تھے پڑ جاتے ہیں پل بھر میں سیاہ
اور ہر موڑ پہ عفریتوں کا ہوتا ہے گماں
کوئی بھی راہ ہو مقتل کی طرف مڑتی ہے
دل میں خنجر کے اُترنے کی صدا آتی ہے
تیرگی خوں کے اُجالے میں نہا جاتی ہے
شامِ غم ہوتی ہے نمناک و ضیا آلودہ

کیفی اعظمی کی آواز بھی ساحر اور علی سردار کی آواز سے شانہ بشانہ چلتی نظر آتی ہے۔ کیفی اعظمی کی نظموں کا رنگ و آہنگ بیانیہ اور طرزِ بیان عمیق کرب کا احساس کراتا ہے۔ عوام کی زبوں حالی، مفلسی، بے بسی نیز تنگ دستی سے وہ مچل اٹھتے ہیں۔ ان کے اندر کا کرب و درد چھلک اٹھتا ہے۔ ایسی کیفیت میں جب کہ ہر طرف سے ان کے کانوں میں چیخ و پکار کا تصادم صدائے بازگشت بن گیا ہو تو وہ کیسے پنبہ بہ گوش رہ سکتے ہیں۔ انھیں مسرت آمیز فضا بھی بے ہنگم اور مایوس کن لگتی ہے۔ جس کا برملا اظہار وہ اپنی شاعری میں پوری توانائی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کی نظموں کا آہنگ، زور شور، تلاطم اور ہیجان، گہرے کرب و بلا کی ترجمانی کرتا اور ذہنوں پر دستک دیتا ہے۔ دائرہ، دوسرا بن باس، مکان، آخری رات، عادت، کسان، چراغاں، آوارہ سجدے، زندگی، بیوہ کی خودکشی اور الجھنیں اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ دائرہ اور دوسرا بن باس، نظم کے چند شعر دیکھیں۔

جسم سے روح تلک ریت ہی ریت
نہ کہیں دھوپ، نہ سایہ، نہ سراب
کتنے ارمان ہیں کس صحرا میں
کون رکھتا ہے مزاروں کا حساب
(دائرہ)

پاؤں سرجو میں ابھی رام نے دھوئے بھی نہ تھے
کہ نظر آئے وہاں خون کے گہرے دھبے
پاؤں دھوئے بنا سرجو کے کنارے سے اٹھے
رام یہ کہتے ہوئے اپنے دوارے سے اٹھے
راجدھانی فضا آئی نہیں راس مجھے
چھ دسمبر کو ملا دوسرا بن باس مجھے
(دوسرا بن باس)

مخدوم محی الدین اسی عہد کی پیداوار ہیں جب ساحر، علی سردار جعفری اور فیض احمد فیضؔ جیسے لوگ شاعری کر رہے تھے۔ اگر بنیادی طور پر دیکھا جائے تو ساحر، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور مخدوم محی الدین کی آواز میں کافی مماثلت ہے۔ مخدوم کا

کرب و درد بھی وہی ہے جو ان مذکورہ شاعروں کا ہے۔ مخدوم بھی چاروں جانب کی افراتفری بدعنوانی اور وحشت زدہ ماحول سے بے چین اور مضطرب ہیں۔ چاند تاروں کا بن، اندھیرا، اپنا شہر، ٹوٹے تارے، سناٹا، رات کے بارہ بجے، احساس کی رات اور جنگ، مخدوم کی ایسی نظمیں ہیں جن میں آپ کو کرب و درد و آہ و بکا کے ساتھ ایک گہری مایوسی، بے زاری، خلفشاری، اضطرابی اور داخلی کرب نظر آئے گا، نیز یہ سب عناصر عوام کے داخلی و خارجی کرب کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہاں 'اندھیرا' اور 'احساس کی رات، نظم کے کچھ مصرعے پیش کیے جاتے ہیں۔

باڑھ کے تاروں میں الجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ
وہ تڑختے ہوئے سر
میتیں، ہات کٹی، پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کے اس پار سے اس پار تک
سرد ہوا
نوحہ و نالہ و فریاد کناں (اندھیرا)

'احساس کی رات' نظم کے یہ مصرعے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

مجھے ڈر ہے کہ کہیں سرد نہ ہو جائے یہ احساس کی رات
نرغے طوفان، حوادث کے، ہوس کی یلغار
یہ دھماکے یہ بگولے سرِ راہ
جسم کا جان کا پیمانِ وفا کیا ہوگا

شاعری کے ساتھ ہی ساتھ کربلائی عناصر اردو فکشن میں بھی بخوبی دیکھے اور تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے گذشتہ صفحے پر رقم کیا ہے کہ ہر صدی کا ادب کربلائی باب ہے بلکہ ایک صدی میں کئی کئی کربلائی باب ہیں، جن کو ہمارے فکشن نگاروں نے شدت سے محسوس کیا اور پھر انہیں اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا۔ تقسیم کا سانحہ ایک ایسا کربلائی باب ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس دورِ فسادات میں انسان ایک ایسے کرب و درد اور سختی و بلا سے دوچار ہوا کہ جسے سن کر ہی روح لرز جاتی ہے تو جنھوں نے اس کرب کو بھوگا اور جھیلا ہوگا ان پر کیا گزری ہوگی۔ ذہن و دماغ پر ایک وحشت اور خوف طاری تھا۔ مسلسل ہونے والے جسمانی، ذہنی اور جنسی ظلم و زیادتی نے اس وقت کے انسان کو پاگل اور نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ ہمارے افسانہ نگار اور ناول نگار جو خود بھی اس کرب سے گزرے اور اس کے چشم دید گواہ تھے، انہوں نے وہ تمام دلدوز اور لرزہ خیز واقعات افسانہ اور ناول کی شکل میں مؤثر انداز میں پیش کر دیے ہیں۔

یہاں پہلے افسانوں کا ذکر کیا جائے گا۔ ایسے افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو کا نام سرِفہرست ہے جنھوں نے فسادات کے موضوع پر کھول دو، ٹوبہ ٹیک سنگھ، انجام بہ خیر، آخری سیلوٹ، یزید، ٹیٹ وال کا کتا، خدا کی قسم، مائی نانکی، موتری، شہید ساز، سہائے۔ علاوہ ازیں حیات اللہ انصاری کا افسانہ ماں بیٹا، آنندی، غلام عباس، بنواس: جمیلہ ہاشمی، اندھیرے میں ایک کرن: سہیل عظیم آبادی، آخ تھو: پریم ناتھ در، آرٹ کا پل: فہیم اعظمی، اپنی شکل: منیر احمد، سمندر قطرہ سمندر: رشید امجد، ایک سنہری پاکستان کا اور ٹائر جلتا رہا (84 کے دنگوں پر) رام لعل، امرت نواس: رفعت سروش، سیڑھیاں: انتظار حسین، جڑیں: عصمت چغتائی، یا خدا: قدرت اللہ شہاب، اپنے آنگن سے دور: خدیجہ مستور، پناہ گاہ: جوگندر پال، سرحد پر: نند کشور، لاجونتی: راجندر سنگھ بیدی، شکر گزار آنکھیں: حیات اللہ انصاری وغیرہ افسانہ نگاروں کے وہ افسانے ہیں جن میں تقسیم کی خونریزی، قتل و غارت گری اور وحشیانہ پن سے جنم لینے والی کربلا کو جگہ جگہ ابھارا گیا ہے۔ جس میں آہیں، چیخیں، آہ و بکا، سینہ کوبی، ماتم اور آہ و زاری سبھی عناصر ہیں۔ ناول نگار بھی

پیچھے نہیں رہے۔انھوں نے بھی فسادات کے موضوع پر ناول تخلیق کیے۔ ایسے خاص خاص ناول کے نام کچھ اس طرح ہیں، غدار: کرشن چندر، گئودان: پریم چند، آگ کا دریا: قرۃ العین حیدر، رقصِ ابلیس: ایم اسلم، خاک وخون: نسیم حجازی، چھٹا دریا: فکر تونسوی، خون اور بے آبرو: فیض رامپوری، یا خدا: قدرت اللہ شہاب، آنگن: خدیجہ مستور، شامِ اودھ اور سنگم: احسن فاروقی، اداس نسلیں: عبداللہ حسین، دشتِ سوس اور تلاشِ بہار: جمیلہ ہاشمی، صدیوں کی زنجیر: رضیہ فصیح احمد، خدا کی بستی: شوکت صدیقی، میرا گاؤں: غلام ثقلین، خونِ جگر ہونے تک: فضلِ کریم فضلی، علاوہ ایسے ناول ہیں جن میں زیادہ تر فسادات کے موضوع، ہجرت کا کرب وغیرہ پہلوؤں اور موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ کچھ ناول فسادات وہجرت سے الگ ہٹ کر بھی خلق کئے گئے ہیں مگر ان تمام ناولوں میں کرب و درد، بے چینی، افسردگی، آلام و مصائب، داخلی تکالیف، روحانی وجسمانی وذہنی اذیت کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتی ہے نیز ان ناولوں میں کربلائی عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں، جنھیں پڑھ کر قاری کو کہیں نہ کہیں اپنا کرب و درد نظر آتا ہے۔ان میں وہ ناول بھی ہیں جو ہماری عہدِ رفتہ کی داستان کو بیان کرتے ہیں اور کچھ ناول وہ ہیں جو 1980 کے بعد بھارت پاکستان میں پیدا ہونے والے مسائل اور کربلا کا پیش خیمہ ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان میں کچھ ایسے بھی ناول لکھے گئے جو 80-90 کے واقعات اور اکیسویں صدی کے دوعشروں کی کرب ناکی اور دردانگیزی سے روبرو کراتے ہیں۔ایسے ناولوں میں آتشِ رفتہ کا سراغ اور مرگِ انبوہ: مشرف عالم ذوقی، دوگز زمین: عبدالصمد، مکان: پیغام آفاقی، پانی: غضنفر، ایک خنجر پانی میں: خالد جاوید، فقط بیان تک: نورالحسنین، اندھیروں کے مسافر: احمد حسین، عکس: عمیرہ احمد، لفظوں کا لہو: سلمان عبدالصمد، گیٹ نمبر-7: عمران عاکف خان، مہاماری: شموئل احمد، روحزن: رحمٰن عباس وغیرہ ایسے ناول ہیں جو اس صدی میں مختلف روپ میں رونما ہونے والے کرب ودرد کا بیانیہ بھی ہیں اور روداد بھی،ان ناولوں اور افسانوں کے موضوعات پر اگر بات کی جائے اختصار سے ہی تو بھی ایک ضخیم کتاب وجود میں آجائے گی جس کا یہ مضمون متحمل نہیں۔لیکن میں نے اپنے مضمون کے مطابق جس کا عنوان ہے ''اردو ادب میں کربلائی عناصر'' حتی الامکان کوشش کی ہے کہ موضوع پر اطلاق ہو سکے۔شاعری، افسانوں اور ناولوں میں اس کرب ودرد کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے جو زمانے کے ہاتھوں سلسلہ بسلسلہ مختلف شکلوں میں عوام کو ملتا ہے۔ عوام جس سے روبرو ہوتی رہی۔ اس میں وہ تحریریں بھی ہیں جو ہندوستانی پس منظر میں لکھی گئی ہیں اور وہ تخلیقات بھی ہیں جو پاکستان کے مسائل کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہیں نیز وہ عالمی ادب بھی ہے جس میں مختلف ممالک میں جنم لینے والی تکالیف و واقعات کو قلم بند کیا گیا ہے۔ملکِ یوکرین بالکل جیتی جاگتی مثال ہے جس کو بے رحم روس نے کربلا سے بھی بدتر بنادیا ہے۔اس سے قبل افغانستان اسی فہرست کا حصہ ہے اور دوسری جنگِ عظیم میں ناگاساکی اور ہیروشیما، جاپان کے شہر اس کرب سے گزر چکے ہیں۔القصہ یہ کہ کربلائی عناصر جو ہمارے دل ودماغ پر اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں اور ایک فن کار کو کسی نہ کسی صنف میں لکھنے کے لئے متحرک اور راغب کرتے ہیں، وہ کربلائی عناصر ان تمام تخلیقات یا فن پاروں میں بکھرے پڑے ہیں جن پر تفصیل سے گفتگو اشد ضروری ہے تاکہ ادب میں یا میدانِ تحقیق میں نئے باب کا اضافہ ہو سکے۔آخر میں چلتے چلتے حسین الحق کا یہ شعر ملاحظہ کریں جو شاید اس پورے مضمون کا لبِ لباب ہے۔

دونوں کو پیاسا مار رہا ہے کوئی یزید
یہ زندگی فرات ہے اور میں حسین ہوں

❑❑❑

سلطان کلیم سنبھلی
سرائے ترین، سنبھل

غزل

مانگتے کیوں ہو یہ جینے کی دعا میرے لئے
ہے نوید زندگی یارو قضا میرے لئے

مخلصوں نے تو بہت ہی کوششیں کی تھیں مگر
راس کب آئی زمانے کی ہوا میرے لئے

آتی رہتی ہیں قفس میں اُڑ کے گل کی پتیاں
ہے وبالِ جان یارو یہ صبا میرے لئے

حالِ دل کہنے نہیں دیتیں مجھے بیتابیاں
کس قدر مشکل ہے عرضِ مدعا میرے لئے

جب ملے موقع چلا دیتے ہیں نشتر طنز کے
ہیں وبالِ جان میرے اقربا میرے لئے

حاسدوں نے تو مٹانے کی بہت کیں کوششیں
بن گئیں ماں کی دعائیں آسرا میرے لئے

روز آ جاتا ہے بن ٹھن کر وہ میرے سامنے
جان لیوا ہے کلیم اُس کی ادا میرے لئے

●●●

اشتیاق علی صبؔا
محلّہ کوٹ، سیتاپور-Mob.9026806400

غزل

نقابِ رُخ اٹھائی ہے مگر آہستہ آہستہ
چلائی دل پہ شمشیر نظر آہستہ آہستہ

کوئی انسان اس دنیا میں کتنا بھی ہو طاقتور
عناصر اس کے جاتے ہیں بکھر آہستہ آہستہ

بنا لے کوئی بھی کتنا محل مضبوط دنیا میں
اسے یہ وقت توڑے گا مگر آہستہ آہستہ

بہت ہی مختصر سا وقت اس دنیا میں ملتا ہے
جو کرنا ہے وہ کر فوراً، نہ کر آہستہ آہستہ

وہ انساں خاکساری جس کی فطرت میں ہے شامل وہ
بلندی پر وہ آئے گا نظر آہستہ آہستہ

یہ مانا زندگی کی ہے ڈگر کانٹوں بھری لیکن
گذر جائے گی یہ بھی رہ گذر آہستہ آہستہ

صبؔا کے قتل کے دھبّے نہ دھو پاؤ گے دامن سے
یہ نا حق خون لائے گا اثر آہستہ آہستہ

●●●

ندیم راعی مرادآبادی
Mob. 8188937127

جگر کا جگر پھٹ گیا

جگر مرادآبادی نام ہے منفرد اسلوب ایک نئے انداز، زخم خوردہ محبوب سوز و گداز حسن و عشق کے امتزاج کا، مترنم آواز، قول وقرار عشق کی تکرار کا، اک مرصع و فا حسین قوس وقزح، مہر ومحبت ، رواداری ومہمان نوازی کا، شفقت وخلوص، حساسیت و خودداری، مفلس ونادار کی پزیرائی اپنے سے بڑوں کی فرماں برداری، چھوٹوں کی ہمت افزائی و دلجوئی کا، عشق معیاری، غم گساری رند اور پھر پرہیزگاری کا۔

جگر مرادآبادی کی شاعری میں ہے تغزل، سلاست روانی، سوز وگداز، ساز وآواز، محبوب سے ملنے کی تڑپ اور جدائی کا کرب، فہم وفہیم، اسلوبِ نو وقدیم، عاجزی اور انکساری بھی، جمالیاتی پہلوؤں کی عکاسی، تہہ داری، وضع داری، حسن وعشق کی آبیاری، غم گساری، نغمگی، دلبستگی، شگفتگی اور برجستگی بھی، جواز سے بھرپور روایت سے چور چور، جگہ بہ جگہ جدیدیت کی پاسداری بھی، تہذیبی، معاشرتی، اخلاقی، سیاسی قدروں کی رنگارنگی اور حسنِ کردار کی بلندی بھی، اشارے، کنائے وغنائیت سے مزین بھی۔

جگر مرادآبادی سرزمین مرادآباد میں پیدا ہوئے جو ایک صنعتی شہر ہے۔ جسے مغل شہنشاہ شاہجہاں کے ایک سپہ سالار رستم مراد نے بسایا تھا۔ جو آج شہر جگر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہاں کی خاک نے جگر کے قدم چومے جس کی فضاؤں میں سانس لی، اردو عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی اور یہاں کی ایک دوشیزہ سے آپ کا نکاح ہوا۔ چشمہ فروشی کے کاروبار سے وابستگی تھی۔ آپ کی طبیعت شاعری کی طرف مائل تو ضرور تھی لیکن آپ کے کلام میں وہ تغزل وہ بانکپن، سلاست وروانی نہیں تھی جو ایک شاعر کو شاعر بناتی ہے۔

ایک سیاہ دن ایسا بھی آیا جب جگر صاحب کو معلوم ہوا کہ ان کی شریکِ حیات جسے وہ بے پناہ چاہتے ہیں بے وفا ہے.......دل تڑپ گیا، کلیجہ منھ کو آ گیا، آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب ابل پڑا۔ جگر کا جگر پھٹ گیا....... پہلے اپنی بیوی کو طلاق دی بعدۂ اپنے پیشے سے سبکدوش ہو کر شراب کو اپنی بانہوں میں سما لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک معمولی شخص علی سکندر، غیر معلولی شہنشاہ تغزل جگر مرادآبادی بن گیا۔

پہلے شراب زیست تھی اب زیست ہے شراب
کوئی پلا رہا ہے پئے جا رہا ہوں میں

....

اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

....

وہ یوں دل سے گذرتے ہیں کہ آہٹ بھی نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

....

اِدھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی، اُن سے آہ بھی نہ ہوئی

....

اُن کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اپنی دیرینہ وخرافات کے اس دور میں بھی جسے بعد میں جگر صاحب خود بھی دور معصیت کہہ کر یاد کرتے تھے۔ ان کی مزاجی کیفیت کتنی شریفانہ اور معصومانہ رہی.......؟ اس ضمن میں رشید احمد صدیقی فرماتے ہیں:

''میں نے جگر صاحب کو ہر حال اور ہر صحبت میں دیکھا ہے۔ خوبصورت، نوجوان، آزاد منش، عورتوں میں، ماں بہن بیٹیوں میں، عمائد اور اکابرین کی موجودگی میں، طلباء، اساتذہ اور دوسرے سنجیدہ اور ثقہ حلقوں میں، گفتار و کردار کے اعتبار سے میں نے ان کو کہیں قابلِ گرفت نہیں پایا۔ ان کی زبان سے کوئی ہلکی بات نہ نکلتی تھی اور نگاہ کبھی بے باک اور بے حجاب نہ ہوتی تھی۔''

۱۹۳۱ء کے آس پاس جگر صاحب اپنے عزیز بزرگ حضرت اصغر گونڈوی کے یہاں شہر گونڈہ میں رہنے لگے اور یہیں سے ملک کے طول وعرض میں مشاعرے پڑھنے جاتے۔ غالباً اس زمانے میں شعراء کو نہ کوئی اجرت اور نہ ہی زادِ راہ ملتا تھا۔ زادِ راہ لینے کا آغاز جگر صاحب نے کیا سب سے پہلے تو آپ نے ندوۃ العلماء، لکھنؤ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی تعمیرات کے لئے بعدہٗ یہ رقم وہ اپنے نجی اخراجات کے لئے قبول کرتے اس رقم کا ایک بڑا حصہ غرباء، ضرورت مندوں اور مہمانوں پر خرچ کرتے نیز آس پڑوس کی بیواؤں کو بلا مانگے عنایت فرماتے مذہبی کاموں میں خاص طور سے حضور اکرمؐ کے میلاد کے چراغاں کے لئے تیل و چراغ کا اہتمام کر کے پورے محلے میں تقسیم کراتے حسن حسین کا لنگر بٹواتے۔

۱۹۵۲ء میں ماہنامہ ''شاعر'' کے معاون مدیر جمیل مہدی نے جگر مرادآبادی کا سراپا کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے:

''پریشان صورت، چہرے پر پریشان زلفیں، گندمی بلکہ مٹ میلی رنگت، جس پر چیچک کے گہرے نشانات کے ساتھ ساتھ کالے دھبے پڑے ہوئے، گول چہرہ، مخمور آنکھیں، پریشان سی کھچڑی داڑھی، اس بدصورت اور بدہیئت انسان کا نام اگر جگر مرادآبادی نہ ہوتو کتنے ہی راہ چلتے لوگ اسے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیا کرتے۔ لیکن بدہیئت و بدصورت ہونے کے باوجود وہ اسٹیج پر جتنا حسین شاعر مجھے نظر آیا اتنا حسین میں نے کسی شاعر کو نہیں دیکھا۔''

جگر صاحب اصغر گونڈوی کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ان کا حکم ہوا کہ ان کی چھوٹی سالی محترمہ نسیم سے وہ نکاح کر لیں۔ تو انھوں نے نکاح کر لیا پھر انھوں نے کہا کہ وہ (جگر مرادآبادی) مسلسل چھ چھ ماہ گھر سے باہر مشاعروں میں رہتے ہیں۔ فرضِ ازدواج نبھانے سے قاصر ہیں لہٰذا اپنی بیوی کو طلاق دے دیں تو

انھوں نے طلاق دے دی۔ جگر صاحب اپنی دوسری بیوی محترمہ نسیم کو بھی بے حد چاہتے تھے۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنے متعدد شعروں میں کیا ہے۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

....

اُف وہ روئے تابناک چشم تر میرے لئے
ہائے وہ زلفِ پریشاں، تا سحر میرے لئے

....

اس سے بھی شوخ تر ہیں اس شوخ کی ادائیں
کر جائیں کام اپنا، لیکن نظر نہ آئیں

یہ پہلے زخم پر دوسرا زخم تھا جو بے حد شدید و کاری تھا۔ جس کی شدت نے جگر صاحب کو غم کے اتھاہ ساگر میں ڈبو دیا شراب کو اپنی محبوبہ بنا لیا اور ایسی ایسی معرکتہ الآرا غزلیں کہیں اور انھیں اپنی نغمگی و درد بھری آواز دی کہ لوگ دیوانے ہو گئے۔ ہر مشاعرہ جگر کا مشاعرہ ہوتا اور جگر مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت بنتے گئے۔ سامعین دیوانہ وار آپ کو چاہنے لگے۔

حالت یہ تھی کہ محترم اپنی شیروانی کی دونوں جیبوں میں شراب کی دو بوتلیں ڈال لیتے، جبکہ وہ پہلے سے ہی پئے ہوتے تھے اور پھر جب وہ شعر پڑھتے تو ان کے کلام میں اتنا درد اور آواز میں اتنا سوز ہوتا کہ ان کے اشعار سننے کے بعد لوگ دل پکڑ کر رہ جاتے۔ یہ تاثیرِ کلام ہی تھی جس نے ان جیسے رند لا اُبالی کو مولانا سیّد سلمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، شاہ عبدالغنی منگلوری اور دوسرے ثقہ و بزرگ ترین افراد کو اپنا ہم نشیں بنا لیا تھا۔ اور یہ پاک باز لوگ ان کے کلام سے لطف اندوز ہونے پر مجبور ہوتے۔

غم گیا ساری کائنات گئی
دل گیا رونقِ حیات گئی
ان کے بہلائے بھی نہ بہلا دل
رائیگاں سعیِ التفاف گئی

....

یاد ہیں اب تک جگر وہ بے قراری کے مزے
درد پیہم کی لگاوٹ زخم کاری کے مزے

....

بیٹھے ہی بیٹھے آگیا، کیا جانے کیا خیال
پہروں لپٹ کے روئے دلِ ناتواں سے ہم

....

حسنِ کافر شباب کا عالم
سر سے پا تک شراب کا عالم

....

دل میں کسی کی راہ کئے جا رہا ہوں میں
کتنا حسین گناہ کئے جا رہا ہوں میں
گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہوں میں

....

کہاں تک عذاب محبت اٹھائیں
بس اب وہ ہمیں، ہم انھیں بھول جائیں

جمیل مہدی اپنے اک مضمون میں فرماتے ہیں:

”جگر صاحب دہلی کے ایک مشاعرے میں جب

غزل پڑھنے بیٹھے تو نشہ میں اس قدر دھت تھے تقریباً بیس منٹ تک جھوم جھوم کرصرف ایک ہی مصرع پڑھتے رہے۔

دل کو جلا کے داغ تمنا دیا مجھے

مشاعروں میں انھیں دیکھنے سننے والے سیلاب کی طرح امڑ پڑتے اور ان کے ہر قسم کے ناز نخرے اٹھاتے اور برداشت کرتے لیکن لوگوں میں ہمت نہیں تھی کہ دم مار سکتے چپ چاپ بیٹھے رہتے پورے مشاعرے میں سناٹے کا یہ عالم کہ سوئی گرنے کی بھی آواز سنائی نہ دے۔بیس منٹ کے بعد دوسرا مصرع یاد آیا تو آنکھیں نیم واکر کے اس انداز میں سنایا کہ سامعین کلیجہ پکڑ کر رہ گئے۔

اے عشق تیری خیر ہو یہ کیا دیا مجھے

یہ مصرع تقریباً دس منٹ تک گنگنانے کے بعد مقطع پڑھ دیا۔

دعویٰ کیا تھا ضبط محبت کا اے جگر
ظالم نے بات بات پہ تڑپا دیا مجھے

مقطع پڑھنا تھا کہ مشاعرے میں جیسے رقت طاری ہو گئی، کئی طرف سے سسکیاں سنائی دیں اور جگر صاحب اٹھ کر چلے گئے آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت لے کر صرف چار مصرعے وہی سنا سکتے تھے اور ان ہی سے سنے جا سکتے ہیں۔

جگر ایک بیدار انسان تھے وطن پرستی وطن دوستی ان کے ریشے ریشے میں سمائی تھی ان کے پیکر میں ایک عجیب وغریب انسان ملتا ہے جو محبت ہی محبت شرافت ہی شرافت تھا عالم سرمستی میں بھی کبھی وہ انسانیت سے گرتے نظر نہ آئے بعض اوقات وہ اس اچانک طریقے پر خطرناک سے خطرناک سچ بول جاتے ہیں کہ حاضرین پر سناٹہ چھا جاتا:

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہوں میں

....

بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ
کوچے کوچے گوشے گوشے لوٹ مچی ہے لوٹ
جنگل جنگل بستی بستی آگ لگی ہے آگ

الہ آباد میں زیر علاج جگر صاحب کی مطلقہ محترمہ نسیم کو ایک ایسے موذی مرض نے گھیر لیا تھا جس کا علاج صرف اور صرف شادی تھا۔لہٰذا ان کی بڑی بہن محترمہ کمن نے اپنے شوہر اصغؔر گونڈوی سے کہا کہ وہ انھیں طلاق دے کر ان کی چھوٹی بہن نسیم سے نکاح کر لیں۔ لہٰذا اصغؔر نے اپنی سالی کی جان بچانے کے لئے ان سے نکاح کر لیا اور اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ (ماخوذ تجدید ملاقات) کچھ ماہ بعد اصغؔر صاحب انتقال فرما گئے اور جگؔر صاحب نے محترمہ نسیم سے دوبارہ نکاح کر لیا۔لہٰذا محترمہ کمن جنھیں جگر صاحب اپنی ماں کا درجہ دیتے تھے ان کے ساتھ رہنے لگیں۔

حریمِ جانِ نازاں ہے جگؔر، کاشانۂ اصغؔر
جو بیٹھو با ادب ہوکر اور اٹھو با ادب ہوکر

محترم قمؔر گونڈوی کے مطابق ''ملک کے معروف و مقبول شعراء جگؔر صاحب سے ان کی رہائش گاہ گونڈہ ملنے آتے جن میں ڈاکٹر راہی معصوم رضا، نرالا صاحب، شعری بھوپالی، گہر گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، ہندی گورکھپوری، شمیم جے پوری،

فنا نظامی، مجروح سلطان پوری، نیاز فتح پوری، علی سردار جعفری، آنند نرائن ملا، عارف عباسی، قمر مرادآبادی سرفہرست ہیں۔ قمر مرادآبادی نہایت ہی خموش طبیعت انسان تھے۔ وہ چپ چاپ ایک طرف بیٹھ جاتے جاتے تھے۔ جگر صاحب تمام ملنے جلنے والوں سے ملاقاتیں کرتے رہتے نہ تو قمر صاحب ان کو اپنی طرف مخاطب کرتے اور نہ ہی جگر صاحب ان سے کچھ کہتے تاہم فرصت ملتے ہی اب صرف اور صرف قمر صاحب سے محوگفتگو ہو جاتے اب چاہے آپ کے دیرینہ دوست مجسٹریٹ عبدالحمید آئیں یا پھر آپ کے رازدار ہم نوالہ ہم پیالہ گونڈہ کے تحصیل دار جناب قیس الہدیٰ فاروقی ہی کیوں نہ ہوں اس وقت کوئی مداخلت نہیں کرسکتا۔ جگر صاحب کا کہنا تھا کہ اب وہ اپنے گھر کی بات کررہے ہیں، اپنی سرزمین مرادآباد کے افراد کا حال چال پوچھنے میں محو ہیں......''

سیاست میں حصہ نہ لیتے ہوئے بھی زیادہ تر قومی سیاسی رہنماؤں سے اتنی قربت کہ دوسروں کو رشک ہو، کیا یہ کام ہر اک آدمی کے بس کا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے سیاسی رہنما آپ کو اپنے ملک کا شہری بننے کی دعوت دیتے ادھر ملک کے صدر جمہوریہ وزیراعظم اعزاز بخشتے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آپ کو ڈی لٹ کی ڈگری دیتی علاوہ ازیں ملک و بیرون ملک کے مذہبی رہنما آپ کے پرستاروں میں شامل اور آپ کی عزت و منزلت کے قصیدے پڑھتے۔

جگر صاحب نے اپنی نعت میں بارگاہِ خداوندی میں التجا کی تھی کہ۔

اس طرح کہ ہر سانس ہو مصروفِ عبادت
دیکھوں میں درِ دولتِ سلطانِ مدینہ

ان کی یہ التجا قبول ہوئی اور آپ کو حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی اور شراب سے توبہ کرلی۔ جگر صاحب کی زندگی کا ایک بڑا حصہ اِدھر اُدھر گذرا وہ جم کر کہیں نہیں رکے مگر ۱۹۴۱ء میں اپنی دوسری مطلقہ بیوی نسیم سے نکاح ثانی کرنے کے بعد گونڈہ ہی میں اقامت پزیر ہوگئے۔

۹؍ستمبر ۱۹۶۰ء کی علی الصبح جگر مرادآبادی اپنے مالکِ حقیقی سے جاملے۔ مشاعرے سونے پڑ گئے ملک میں صف ماتم بچھ گئی اردو ادب کا ایک شہنشاہ پرستارانِ اردو کو روتا بلکتا چھوڑ گیا۔ ادبی آسمان گہن آلود ہوگیا۔ آپ کے جنازے میں قرب و جوار اور دور دراز سے لوگوں کے آنے کا لامتناہی سلسلہ جاری ہوگیا۔ نماز جنازہ آٹھ بار پڑھائی گئی۔ شعراء، ادباء، علماء، فلا سفر، سیاستداں، اہل اقتدار، تجار و دیگر ہزاروں افراد نے جنازے میں شرکت کی۔ گونڈہ بسا بسایا ادبی شہر قصّہ پارینہ ہوگیا۔

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

خلیل الرحمٰن اعظمی نے جگر صاحب کی موت پر اپنے تاثرات کا اظہار جن لفظوں میں کیا تھا وہ آج بھی اتنے ہی سچے ہیں۔

''آخر وقت تک جگر کی شاعری میں پھیکا پن نہیں آیا ان کی آواز دوسرے شعراء کی طرح عمر ڈھلنے کے بعد پتلی نہیں ہوئی وہ ستر کی عمر کو پہنچ کر بھی ہمارے لئے تبرک نہیں بنے۔ جگر اپنی عمر کی کسی منزل میں زمانۂ ماضی کے شاعر نہیں سمجھے گئے ان کی موت کے بعد ایسا لگتا ہے کہ اُردو زبان نے اپنا ایک جوان بیٹا کھو دیا ہے۔''

❑❑❑

جمیل احمد جمیلؔ
اشرف آباد، لکھنؤ- Mob. 9415780888

غزل

افسوس جنہوں نے بھی دلائل نہیں دیکھے
منصف وہی انصاف پہ مائل نہیں دیکھے

بڑھنے لگا کیا زور امیری کی وبا کا
کچھ روز سے ہم نے یہاں سائل نہیں دیکھے

مانع ہیں نہ خوشیاں مرے جیون کے سفر میں
اور غم بھی کبھی درمیاں حائل نہیں دیکھے

تقدیر و مشقت پہ یقین جن کا ہے پختہ
ہم نے وہی تقدیر کے قائل نہیں دیکھے

ملبوس و غذا عمدہ ہیں چہرے پہ بشاشت
کیا تم نے غریبوں کے مسائل نہیں دیکھے

حاوی نہ ہوئی یاس کے لمحوں کی طوالت
امید ترے حوصلے زائل نہیں دیکھے

انسانوں میں اس دورِ پر آشوب سے ہٹ کر
ہم نے تو جمیلؔ ایسے خصائل نہیں دیکھے

●●●

شریفؔ قریشی
فتح گڑھ-Mob.9044674701

غزل

بھٹک نہ جاؤں کہیں سیل تیرگی سے بچا
مجھے پرائے چراغوں کی روشنی سے بچا

ہر اک زبان پہ تازہ لہو کا ذائقہ ہے
درندگی سے ہراساں ہوں، آدمی سے بچا

جنوں کو میری ہلاکت کا اختیار نہیں
بچا سکے تو مجھے میری آگہی سے بچا

ہر ایک سائے کو اپنا وجود کھونا تھا
وہ رزق دھوپ کا ٹھہرا جو چاندنی سے بچا

کسی نے پھول عجب زاویے سے مارا تھا
میں بال بال عذابِ شکستگی سے بچا

جو اُس کی یاد کے عالم سے بے نیاز کرے
مرے خدا مجھے ایسی بُری گھڑی سے بچا

شریفؔ کے لئے سنجیدگی بھلی یارب!
جو آنسوؤں میں نہائی ہو اُس ہنسی سے بچا

●●●

شاہد پٹھان
جے پور-Mob.9372843907

لکشمی نارائن فارغؔ: کہتے رہے فسانہ غم روزگار کا

(آمد۔ ۱۹۰۹ء۔ رخصت۔ ۲۰۰۷ء)

ہماری زندگی مختصر کا سرمایہ
ہمارے بعد زمانے کے کام آئے گا

سیمابؔ اکبرآبادی کے غیر مسلم تلامذہ میں ایک اہم نام لکشمی نارائن فارغؔ کا بھی ہے۔ ان کے بزرگ راولپنڈی کے رہنے والے تھے اور ملازمت کے سلسلے میں ریاست جموں وکشمیر کے قصبے ''ریاسی'' میں سکونت پزیر تھے۔ فارغ ۹رجنوری ۱۹۰۹ء کو بمقام ''ریاسی'' پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۰ء کو انھوں نے بی.اے. پاس کیا۔ ۱۹۳۱ء میں وہ تلاشِ معاش کے سلسلے میں واردِ جے پور ہوئے اور ۱۹۳۲ء کو یہاں کے فوجی محکمہ میں بحیثیت کلرک ملازمت شروع کی۔ کچھ ہی عرصہ بعد ملٹری ہیڈ کواٹرس اُدے پور میں آفس سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ پر فائز ہوئے اور محنت، دیانتداری اور فرض شناسی کے باعث ترقی کرکے تشکیل راجستھان کے بعد راجستھان سکریٹریٹ میں سیکشن آفیسر بنائے گئے۔ ۱۹۶۶ء میں ڈپٹی سکریٹری کے عہدے سے پنشن یاب ہوئے'' [1]

لکشمی نارائن فارغؔ عمر کے آخری برسوں میں صاحبِ فراش رہے، انھوں نے ۱۵رجنوری ۲۰۰۷ء کو جے پور میں انتقال کیا۔

فارغؔ کو شعر گوئی کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ قریب پندرہ سال کی عمر سے وہ شعر کہنے لگے۔ ۱۹۴۰ء کو سیمابؔ اکبرآبادی سے سلسلۂ تلمذ قائم ہوا۔ جناب پریم شنکر سریواستو کے بقول:

''سیمابؔ کے مشوروں نے فارغؔ کی شاعری کے حسن کو نکھارنے میں کافی مدد پہنچائی، زبان سنورگئی اور کلام میں ستھرا پن آگیا'' [2]

فارغؔ نے سیمابؔ صاحب سے شاعری کے ساتھ ہی علمِ عروض میں بھی خاطر خواہ استفادہ کیا، رفتہ رفتہ انھیں اس علم پر مہارت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ خداداد خاں مونس کے مطابق:

''فارغؔ صاحب کو فنِ عروض سے دلچسپی ہی نہیں اس پر آپ کو پوری دستگاہ حاصل ہے۔ آپ نے فنِ عروض وقافیہ پر ایک رسالہ بھی تصنیف کیا ہے، اس کے علاوہ مرزا غالبؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، نواب مرزا داغؔ، علامہ اقبالؔ، اصغر گونڈوی، علامہ سیماب اکبرآبادی، اعجاز صدیقی اور مولانا قمرؔ واحدی وغیرہ کی منتخب غزلوں کی بحریں تلاش کرکے ان پر مشتمل ایک رسالہ بھی مرتب کیا۔ اسی طرح اپنے پسندیدہ اشعار کے فنی نکات پر

مشتمل تین بیاضیں بھی ترتیب دی ہیں۔ ان کے علاوہ علامہ سیمابؔ کی اصلاحوں کو رسالے کی صورت میں یکجا کیا گیا ہے۔ فارغؔ صاحب نے چند اپنشدوں اور گیتا کے اشلوکوں کی مختصر تفسیر بھی لکھی ہے، آپ نے نثر میں اپنی خودنوشت سوانح حیات بھی تحریر فرمائی ہے''۔ ۳؎

لکشمی نارائن فارغؔ نے مختلف شعری اصناف مثلاً غزل، نظم، رباعی اور قطعہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ خداداد خاں مونسؔ کے بموجب فارغؔ کا انتخابِ کلام ''جذبِ دروں'' کے نام سے طباعت کے لیے تیار ہو چکا تھا'' ۴؎ مگر بوجوہ اس منتخب کلام کی اشاعت ہنوز عمل میں نہ آسکی۔ البتہ ''احساساتِ فارغؔ'' کے نام سے فارغؔ کی غزلیات کا ایک مجموعہ راجستھان اردو اکیڈمی نے ۹۹۔۱۹۹۸ء میں شائع کیا ہے۔ جو ایک سو غزلیات پر مشتمل ہے۔ فارغؔ صاحب کے ہمسایہ ڈی۔آر۔مدان ہوشؔ سرحدی صاحب (۱۹۲۸ء تا ۲۰۱۱ء) کی اطلاع کے مطابق ''جذبِ دروں'' میں نظمیہ شاعری، قطعہ، رباعیات اور غزلیات شامل ہیں جو اشاعت کا منتظر ہے۔ فارغؔ صاحب کی تمام غیر مطبوعہ نثری و شعری تصانیف ان کے صاحبزادگان کے پاس محفوظ ہیں۔

فارغؔ کی شعر گوئی کا سلسلہ تقریباً ساٹھ برسوں کو محیط ہے۔ اس دوران فارغؔ نے زیادہ شعری سرمایہ تخلیق نہیں کیا، تاہم جس قدر سرمایۂ سخن انھوں نے یادگار چھوڑا ہے، وہ ان کی شاعرانہ واستادانہ حیثیت منوانے کے لیے کافی ہے۔ سرِ دست فارغؔ کے مطبوعہ کلام (احساساتِ فارغؔ) کی روشنی میں ان کے شعری افکار وفنی خصائص کا مطالعہ مقصود ہے۔

فارغؔ نے آزادیٔ وطن کی جدوجہد کے دور میں ہوش کی آنکھیں کھولیں، ان کے آغازِ سخن کا زمانہ 'ترقی پسند تحریک' کی عمل آوری کا زمانہ بھی ہے۔ چنانچہ فارغؔ شروع ہی سے شعر و ادب کے افادی و مقصدی منصب کے قائل اور اس کے فطری تفاعل کے موئدر ہے ہیں۔ سیمابؔ اکبرآبادی سے سلسلۂ تلمذ قائم ہونے کے بعد فارغؔ نے شعر گوئی پر سنجیدگی سے توجہ کی اور اپنے احساسات و افکار کا اظہار متوازن و پختہ کار اسلوب میں کرنے لگے۔ انھوں نے اپنے شعری اسلوب و آہنگ میں نعرہ زنی، جذباتیت اور بلند آہنگی سے بڑی حد تک احتراز برتا ہے۔ ان کے استعارات، علامات اور ڈکشن میں کلاسکی غزل کے ڈکشن اور فنی وسائل سے اخذ و استفادہ کا عمل دیکھنے کو ملتا ہے۔ مگر معنوی اور موضوعاتی سطح پر فارغؔ کے شعری آثار میں ان کے آشوبِ عہد و حیات کی نقش گری دیکھنے کو ملتی ہے۔ یوں تو فارغؔ ''تخلیقی عمل'' میں فنکار کی ذہنی کاوش وسرگرمی کے ساتھ ساتھ قلبی سوز دروں کی مشارکت کے بھی قائل ہیں۔ مگر ان کے متعدد اشعار سے ''شعری عمل'' میں فکر وخیال اور تصور کی اہمیت ومعنویت کا اثبات خاص طور پر ملتا ہے۔ اس سلسلے میں حسبِ ذیل اشعار دیکھے جاسکتے ہیں۔

تصورات کی دنیا لیے ہوئے آیا
بشر کے ساتھ زمانے میں شاعری آئی

فکرِ ناحق کو نہ سینے سے لگاؤں کیسے
فکرِ ناحق ہی مری زیست کا سرمایہ ہے

مطلعِ فکر سے پھوٹی ہے کوئی ایک کرن
گوشۂ دل کی طرف اس کا گزر ہو کہ نہ ہو

تصورات سے اپنے سجا فضاؤں کو
فروغِ صبحِ درخشاں کا انتظار نہ کر

نئے قصے مرتب ہو رہے ہیں
پرانی داستانیں ہیں فراموش

نہ خود سری کا نتیجہ نہ سرکشی کی دلیل
مذاقِ سعیِ مسلسل ہے زندگی کی دلیل

منظر فکر و تصور ہی سجایا جائے
عہدِ رفتہ کا نشاں دل سے مٹایا جائے

سرد پڑتی جارہی ہیں زیست کی چنگاریاں
ہے مگر شعلہ بداماں شمعِ افکارِ حیات

فارغؔ، تخلیقی سرگرمی میں فکر وتصور کی کارکردگی کے اعتراف کے ساتھ ہی تخلیق کار کے دلی احساس وعرفان کی ثمر آوری کے بھی معترف ہیں۔ عارفین وکاملین نے قلبِ انساں کو خانۂ خدا سے تعبیر کیا ہے۔اور آتش کدۂ قلب سے نمودار ہونے والے جذبات و احساسات کی تقدیس و ترفع کا اعتراف بھی دنیا کے تمام اہلِ فکر نے کیا ہے۔ فارغؔ نے بھی اپنے افکارِسخن میں انسان کے حریمِ قلب میں نمو پزیر احساسی و جذباتی تقدیس کی ترویج و تائید کی ہے۔اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہی دل رہنمائے خیر و شر ہے
ہدایت سب کو ملتی ہے یہیں سے

تخیلات میں وسعت بکھنے تو ہوگئی پیدا
جو پیدا قلب میں وسعت کرو تو بات بنے

رفتہ رفتہ دلِ دیوانہ بھی
محرمِ راز ہوا جاتا ہے

منور ہے شبستانِ تصور
فروغِ جلوۂ شمعِ یقیں ہے

سکونِ زندگی کا ہے سہارا
تمنا گرچہ سعیِ رائیگاں ہے

خوب ہیں فکر وتصور کے بھی ایواں فارغؔ
زندگی شدتِ احساس کا در چومے ہے

شدتِ احساس پر فارغؔ جلا ہوتی رہی
اور دل حرماں طلب اندوہ گیں ہوتا رہا

غرض کہ فارغؔ کے گلزارِسخن میں جہاں ذہنی تصورات و افکار کے گلہائے رنگارنگ ہیں وہیں قلبی سوز واحساس کے غنچوں کی کسک بھی موجود ہے۔تخلیقی عمل دراصل قدرتی طور پر جذبہ واحساس اورفکر وتصور کے حسنِ امتزاج سے نمو پزیر ہوتا ہے، اپنے چھ دہائیوں کومحیط شعری سفر میں فارغؔ نے احساس و افکار ہر دو سطحوں پر حیات وکائنات کے بدلتے ہوئے مناظر اورتہذیبی سطح پرنمودار ہونے والے مظاہر کا بہ چشمِ عمیق مشاہدہ کیا ہے۔ انھوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پرتفکر آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے اپنے احساسات و

تجربات کا اظہار کچھ اس انداز سے کیا ہے۔

فضائے دوعالم کا دیکھا تماشا
بچا کر نظر ہم نے دیوار و در سے

ہزاروں بار تہذیب و تمدن کی فضا بدلی
ہزاروں بار اک دنیا نئی ایجاد کی میں نے

ان کا غم بھی غمِ دوعالم بھی
مختصر غم کی کائنات نہیں

فکرِ فردا ہے کبھی ، رنج و غمِ دوش کبھی
کس قدر روحِ بشر موردِ آفات ہوئی

قصرِ امروز کے دریچوں سے
صبحِ فردا کو ہم نے دیکھا ہے

ہمیشہ رکھتا ہوں رختِ سفر میں ساتھ اپنے
ہے میرے ساتھ غمِ روزگار صحرا میں

رنجِ ماضی ہے، فکرِ فردا ہے
حشر کیسا یہ دل میں برپا ہے

پیرہن فکر و تصور کا بدل جاتا ہے
صبحِ فردا کے جب آثار عیاں ہوتے ہیں

اپنی حدیثِ غم تو بیاں ہم نہ کر سکے
کہتے رہے فسانہ غمِ روزگار کا

جیسا کہ مذکور ہوا، فارؔغ نے کلاسکی غزل کے فنی وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے احساسات وافکار کے بیان کے لیے متوازن اسلوب وآہنگ برتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے دورِ عروج میں پروان چڑھنے والے بہت کم شعرا بلند آہنگی، واشگاف نگاری اورنعرہ زنی سے محفوظ رہ سکے ہیں۔ فارؔغ بھی انھیں معدودے چند شعرا میں شمار ہوتے ہیں، جنھوں نے محتاط اسلوبِ بیان اختیار کرتے ہوئے اپنا تخلیقی سفر طے کیا ہے۔ ممکن ہے ان کی منظومات میں ''ترقی پسندانہ اسلوب'' مترشح ہو، مگر غزلیہ شاعری میں فارؔغ نے ایمائی اور خود کلامی کے اسلوب کا استنباط کیا ہے۔ فارؔغ کو اس حقیقت کا احساس وعرفان ہے کہ ''شعری اسلوب'' فنکار کے اندازِ فکر وتصور کا ترجمان ہوا کرتا ہے، نیز یہ کہ تخلیق کار کے شعری افکار میں اگر پختگی اور بالیدگی موجود ہے تو اسلوب وآہنگ میں بھی استحکام واعتدال کا درآنا فطری ہے۔ چنانچہ فارؔغ نے اپنی شاعری میں بڑی حد تک معتدل ومتوازن اسلوب اختیار کیا ہے۔ درج ذِیل اشعار میں فارؔغ کے سماجی شعور اور ترقی پسندانہ حسیت و بصیرت کا شعری اظہار دیکھا جا سکتا ہے۔

زیرِ خنجر بھی مسکرائے ہیں
گیت سولی پہ ہم نے گائے ہیں

یہی اچھا ہے کہ مجبوروں کو
اپنی مجبوری کا احساس نہیں

کیوں آہ و فغاں ہوں نہ شرر ریز اے فارؔغ
جذبات کے دامن میں ابھی آگ بھری ہے

چشمِ باطن پر رموزِ آگہی کھلتے رہے
روز و شب محکم مرا ذوقِ یقیں ہوتا رہا

نہیں ستاتے کسی کو بھی جو زمانے میں
وہی زمانے میں اکثر ستائے جاتے ہیں

یتیموں کے نالے، غریبوں کی آہیں
تمدن کی آندھی کی ہیں یہ گھٹائیں

ترا لطف و کرم برحق مگر اے ساقیِ دوراں
وہی ہے تشنگی اپنی، وہی جامِ تہی اپنا

آہ کرتے ہیں نہ سرگرمِ فغاں ہوتے ہیں
ایسے مظلوم زمانے میں کہاں ہوتے ہیں

کتر لیتی ہے بال و پر فضا میں اڑنے والوں کے
بڑی کوتاہ بیں ہے گردشِ ایام اے ساقی

دیکھ کر بگڑا ہوا فارؔغ نظامِ زندگی
دل پریشاں ہوگیا، جذبات برہم ہوگئے

تجدید مقاصد کا ہے شاید یہ نتیجہ
ہر سمت بپا شورشِ آشفتہ سری ہے

خون پانی کی طرح میرا بہانے والا
نشترِ غم نہ سہی خنجرِ قاتل ہوگا

پیرہن بدلے گی اپنا زندگانی خود بخود
دیکھ کر نیرنگیٔ صبحِ بہارِ انتظار

فارؔغ تھی جن کے دستِ شفا کی جہاں میں دھوم
وہ بھی علاجِ گردشِ دوراں نہ کرسکے

فارؔغ نے اپنے عصری وتہذیبی تناظر کے متضاد میلانات و معاملات کو بغور دیکھا اور شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان میں تہذیبی و معاشرتی سطح پر رونما ہونے والی بحرانی صورتِ حال کے فارؔغ کے آئینۂ احساس پر گہرے نقوش اُبھرے ہیں، چنانچہ انھوں نے نفرت وتعصب اور افلاس وغربت کے پیدا کردہ دل سوز ماحول ومظاہر کو اپنی شعری حسیت کا اہم حصہ بنایا ہے، ایک نئی آزاد مملکت میں پنپنے والی حرص و ہوس ،بغض،تعصب، بے حسی اور بیگانہ وشی کی عام کیفیات کا اظہار فارؔغ نے خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ ساتھ ہی اہلِ سیاست کی خود پرورانہ ذہنیت اور عوام الناس کے ساتھ روا رکھی جانے والی سرد مہری اور ناانصافی کا موثر بیان فارؔغ کی شاعری میں بدرجۂ اتم ملتا ہے، آزادیٔ ملک سے وابستہ عوام کی امیدوں اور خوابوں کی شکست اور ناکامی کا احساس فارؔغ کے یہاں نمایاں ہے۔ غیروں کی جگہ اپنوں کا نظامِ حکومت اور ان کے ذریعے رَوا رکھی جانے والی سماجی ناانصافی ، بدسلوکی، حق تلفی اور ظلم وستم کے خلاف فارؔغ نے صدائے حق بلند کی ہے ۔ ہمارے دوسرے حساس شعرا کی مانند فارؔغ بھی ”آزادی“ کو نامکمل وناقص سمجھتے ہیں، انھوں نے اپنے بہت سے غزلیہ اشعار میں اس نوعیت کے احساسات کا اظہار کیا ہے۔ ذیل کے اشعار سے ہمارے خیال کی توثیق ہوسکے گی ۔

یہ طوفاں اور یہ امواج و گرداب
خدائے کشتی و ساحل کہاں ہے

سفینہ جب ترے ہوتے ہوئے بھی ڈوب سکتا ہے
اٹھائے پھر ترا احسان کیوں اے ناخدا کوئی

گل چیں سے تو نجات گلستاں کو مل گئی
جاری مگر ہے سلسلہ برق و شرار کا

رُک گئے قافلے بہاروں کے
بام و در ہم نے جب سجائے ہیں

ہیں فسردہ غنچہ وگل آج بھی
آج بھی گل چیں ہے فارؔغ شاد کام

صبحِ فردا نظر سے ہے روپوش
ہے بشر کس قدر تغافل کوش
صبحِ فردا کے یہ علمبردار
ہیں ابھی تک اسیر حلقۂ دوش

آسودگئ فکر کا ساماں نہ کرسکے
ہم کاہشِ حیات کا درماں نہ کرسکے

دل کے ویرانے کسی طرح سجائے نہ گئے
ہوئے ویران جو یہ گھر تو بسائے نہ گئے

خزاں نے کیوں نچوڑا ہے رگِ گل سے لہو برسوں
ہوا ہے موسمِ گل میں بھی خونِ آرزو برسوں

رہا جاری خزاں کا سلسلہ بھی موسمِ گل میں
گلستاں کو نہ راس آئی فضائے رنگ وبو برسوں

وہی منظر ہے گلشن کا جو منظر ہے بیاباں کا
یہاں دامن کے ٹکڑے ہیں یہاں پرزے گریباں کے

یہ دستور کیسا ہے تیرے جہاں کا، خدایا یہ کیسی ہے تیری خدائی
گرفتارِ دامِ بلا ہوگئے ہم ملی گر کمندِ وفا سے رہائی
بدلتی رہی ہے فضائے تصور، بدلتا رہا ہے نظامِ تمنا
مگر تیری محفل کا بدلا نہ عالم، وہی سرد مہری وہی کج ادائی
سکونِ قفس بھی میسر تھا مجھ کو، میسر ہے آسائشِ آشیاں بھی
خرابی تو میرے مقدر کی دیکھو، نہ وہ راس آیا، نہ یہ راس آئی

نہ غنچوں میں پہلی سی بوئے وفا ہے، نہ پھولوں میں پہلی سی رنگینیاں ہیں
یہی رنگ وبو ہے تو کیا رنگ وبو ہے، یہی گلستاں ہے تو کیا گلستاں ہے

میں ماتمی ہوں اپنے دلِ سوگوار کا
مجھ سے کہے نہ کوئی فسانہ بہار کا

ہمارا صبر و تحمل تو دیکھیے فارؔغ
خزاں چمن میں گزاری، بہار صحرا میں
چمن میں جشنِ بہاراں منا کے دیکھ لیا
منا کے دیکھیے جشنِ بہار صحرا میں

فارؔغ نے یوں تو عہدِ جدید کے بحرانی ماحول اور عصری آشوب وانتشار کے اظہار پر توجہ مرکوز کی ہے، تاہم ان کے یہاں انفرادی اظہار بھی دکھائی دیتا ہے، جس میں

ان کے داخلی محسوسات اور ذاتی تجربات جلوہ نما ہیں ۔آج کے صنعتی اور صارفیت شعار کلچر میں ایک حساس انسان و فنکار جن ذہنی اذیتوں اور آزمائشوں سے دوچار ہوتا ہے، ان سے فارغؔ بھی دوچار ہوئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے گاہ خود کلامی اور کبھی خطابیہ لہجے میں اپنے وجودی محسوسات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

دیکھتا ہوں شام سے تا صبح خوابِ آرزو
دیکھتا ہوں صبح سے نیرنگِ عالم شام تک

کتنے ستم ظریف ہیں بزمِ جہاں کے لوگ
لیتے ہیں مجھ سے میری وفا کا بھی انتقام

لحظہ لحظہ بکھر رہی ہے زیست
یہ بھی جینے میں کوئی جینا ہے

سکونِ زندگی کا ہے سہارا
تمنا گرچہ سعیِ رائیگاں ہے

کج کلاہوں سے مری جنگ رہی ہے برسوں
مجھ پہ آغوشِ سکوں تنگ رہی ہے برسوں

وہ درد جس کا ہو نہ سکا آج تک علاج
اس دردِ جاں گداز کے درماں کی بات ہے

بہت دُشوار تھا مر مر کے جینا
بالآخر ہم نے یہ بھی کر دِکھایا

سکونِ قلب ہی فارغؔ دلیلِ زیست نہیں
ہے اضطرابِ مسلسل بھی زندگی کی دلیل

یادِ رفتہ بھی ستاتی ہے مجھے رہ رہ کر
فکرِ فردا بھی مرا دامنِ دل چومے ہے

کس کو فارغؔ سناؤں حالِ دل
بزمِ عالم میں سب ہیں پنبہ گوش

سہارا بال و پر کا ڈھونڈتی ہے
مری فکرِ رسا کو ہو گیا کیا

غمِ ایام کا ہر اک منظر
شدتِ درد بڑھا جاتا ہے

غیر تو غیر سہی اپنوں کو بھی اے فارغؔ
میں نے بیگانۂ دستورِ وفا پایا ہے

سرورِ بادۂ عشرت کے ساتھ اے فارغؔ
مرے ضمیر میں غلطیدہ شدتِ غم ہے

فارغؔ کو اپنے زمانہ میں فروغ پزیر ایجادات اور جدید علوم وفنون کی برکات کا اعتراف ہے، انہوں نے آدمِ خاکی کے فکری اجتہاد اور فنّی کمالات کی تحسین کرتے ہوئے اپنے احساسات کا کچھ اس طرح اظہار کیا ہے۔

ہماری فطرتِ سادہ مزاج نے فارغؔ
سکھا دیے ہیں زمانے کو فکر و فن کیا کیا

نئے سانچے مرتب ہو رہے ہیں فکرِ انساں کے
نئے آثار پیدا ہیں طلوعِ صبحِ امکاں کے

عطا کر کے سعیِ مسلسل کا سودا
لیے کام قدرت نے کیا کیا بشر سے

نئے قصے مرتب ہو رہے ہیں
پرانی داستانیں ہیں فراموش

فارغؔ اسی کا کیف و اثر زندگی میں ہے
نظم و نظامِ زیست ہے مرہونِ آرزو

ذرۂ ناچیز ہے انساں، مگر
ہے جہاں میں منتخب اس کا مقام

عہدِ جدید کی سائنسی ایجادات کے فیوض و برکات کے اعتراف کے ساتھ ہی ساتھ فارغؔ ہمیں تصویر کا دوسرا رُخ بھی دِکھانا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انسان نے اپنے ایجاد کردہ اسباب وعلوم کا استعمال مثبت امور کے ساتھ ساتھ منفی طور پر بھی کرنا شروع کر دیا ہے۔سائنسی آلات نے ہزاروں برسوں کی پروردہ تہذیبوں کے آثار ونقوش مٹانے کا بھی کام کیا ہے۔گویا کہ انسان نے جن علوم و اسباب کی کھوج انسانی فلاح اور ملکی ترقیات کے لیے کی تھی ، انہیں اشیاء کا استعمال اب بنی نوعِ انسان کی تباہی و بدحالی کے لیے کیا جانے لگا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ رویہ انسانیت کے منافی ہی نہیں بلکہ مہلک بھی ہے۔ چنانچہ فارغؔ اپنے تفکرات کا اس طرح اظہار فرماتے ہیں۔

فسادِ علم و فن دیکھا فتورِ خیر و شر دیکھا
بپا ہر چار سو ہنگامۂ فکر و نظر دیکھا

منتشر شیرازۂ فکر و تصور ہوگیا
انتشارِ زیست کے ساماں فراہم ہوگئے

نعمت علم و ہنر دے کر ہمیں
لے رہی ہے کیوں مشیت انتقام

ہوئے جتنے بہم ساماں حصولِ شادمانی کے
کمی اتنی ہی کیف زیست میں محسوس ہوتی ہے

دامن کشِ حیات رہی فکر بیش و کم
ہر چند لوگ چاند ستاروں پہ چھا گئے

بزمِ ہستی ہے وہ نقشِ ناتمام
تشنۂ تکمیل ہے جس کا نظام

ہائے مجبوریاں مشیت کی
آدمی آدمی کو ڈستا ہے

حدیثِ زیست کے عنواں ہیں حادثاتِ حیات
حدیثِ زیست کے عنوان ماہ و سال نہیں

فروغِ علم نے خیرہ کیا نگاہوں کو
ہماری راہ میں حائل یہ روشنی آئی

ہر چند فروزاں شمعیں ہیں علم اور ہنر کے عالم میں
تاریک ہیں لیکن اے فارغؔ فکر اور نظر کے کاشانے

مہ و انجم سے اب ٹکرا رہی ہے
یہی ہے خود سری کی انتہا کیا

تا حد نظر اب تو طوفاں نظر آتا ہے
پھر زد میں حوادث کی انساں نظر آتا ہے

فارغؔ کو چوں کہ زندگی کی صالح اقدار پر پورا اعتماد ہے، اس لیے وہ کائنات کے یاس واندوہ کے ماحول میں حیات بخش افکار واقدار کی بشارت بھی دیتے ہیں۔ نئے معاشرے کے انسان میں انھیں بہت سی خرابیاں اور کوتاہیاں نظر آتی ہیں مگر ساتھ ہی فارغؔ کی چشمِ حقیقت نگر بنی نوعِ انسان میں موجود مثبت پہلوؤں کو بھی دیکھنے کی سکت رکھتی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

فطرتاً نوعِ بشر مائلِ پیکار سہی
جذبۂ امن کے بھی ہوتے ہیں خوگر کچھ لوگ

زندگی مجموعۂ فکر پریشاں ہی نہیں
زندگی ہے دفترِ احساس کی تفسیر بھی

عالمِ جذبات بدلے لاکھ اپنا پیرہن
ہم نے بدلا ہے نہ ہم بدلیں گے معیارِ حیات

مِری بزمِ تصور کی فضا میں
نمودِ صبحِ فردا ضو فشاں ہے

لکشمی نارائن فارغؔ نے غزل کے علاوہ نظم، قطعہ اور رُباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے، نظمیہ شاعری کے مطالعے سے فارغؔ کے مزید شعری جہات وخصوصیات واضح ہو سکیں گے، ان کی شاعری میں معنی خیز فنی رکھ رکھاؤ ملتا ہے۔ اپنے احساسات وافکار کو شعری پیکر عطا کرنے کا ہنر انھیں خوب آتا ہے، چنانچہ ان کی غزل میں فکر اور فن کی جہتیں باہم دگر مربوط نظر آتی ہیں، فارغؔ نے غزل کو زندگی کے بوقلموں مناظر و مظاہر کی ترجمان بنانے کی بڑی حد تک کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کا یہ شاعرانہ دعوا اپنے اندر کسی قدر سچائی رکھتا ہے۔

ماند پڑ سکتی نہیں ان کے تصور کی ضیا
جن کی نظروں میں ہو جلوہ ریز رخسارِ حیات

داستاں میری مکمل داستانِ زیست ہے
حسن کا قصہ بھی ہے اور عشق کی روداد بھی

❑❑❑

حوالے:

۱۔ تعارف وانتخاب کلامِ فارغؔ ص ۱، مرتب خداداد خاں مونس، ناشر راجستھان اردو اکیڈمی جے پور مطبوعہ ۱۹۹۱ء
۲۔ راجستھان کے موجودہ اردو شاعر (تعارف ونمونۂ کلام) ص ۱۹، مرتب پریم شنکر سریواستو، ناشر راجستھان ساہتیہ اکیڈمی، اودے پور، مطبوعہ ۱۹۶۶ء (دیوناگری)
۳۔ تعارف وانتخاب کلام لکشمی نارائن فارغؔ۔ ص ۲، ناشر راجستھان اردو اکیڈمی جے پور، مطبوعہ ۱۹۹۱ء
۴۔ ایضاً

ضیا کاملی
ٹانڈہ، امبیڈکرنگر-Mob.9335578930

غزل

ہم مسکرائیں بھی تو مگر کتنی دیر تک
پانی کے بلبلوں کا سفر کتنی دیر تک

اشکوں نے سارے عکس مٹا ڈالے آنکھ سے
ساحل پہ رہتا ریت کا گھر کتنی دیر تک

حاکم جو بن گیا ہے تو پھر عدل کرنا سیکھ
قائم رہے گی فتح و ظفر کتنی دیر تک؟

تو بھی تو باز آ جا چلانے سے تیر اب
وہ بھی رہے گا سینہ سپر کتنی دیر تک

بازارِ حسن سجتا ہے چاروں طرف یہاں
اک تجھ پہ ہی رہے گی نظر کتنی دیر تک

رہتے ہیں لوگ جسم کی قربت کے منتظر
یہ عشق و عاشقی کا اثر کتنی دیر تک

اک منزل حسیں ہے ضیا کاوشوں کے بعد
مشکل ڈگر ضرور ہے پر کتنی دیر تک

●●●

قمر خیرآبادی
خیرآباد، سیتاپور-Mob.7905566201

غزل

اٹھا کر وفا کا علم دیکھتے ہیں
وہ ڈھائیں گے کب تک ستم دیکھتے ہیں

ملے تو کوئی دل سے ہم اہل الفت
کہاں عزو جاہ و حشم دیکھتے ہیں

بھرم ٹوٹ جاتے ہیں رنج و الم کے
ترے گیسوؤں کے جو خم دیکھتے ہیں

نوازا ہے رب نے جنھیں مال و زر سے
غریبوں کی جانب وہ کم دیکھتے ہیں

فنا کر لیں خود کو یہ آتا ہے جی میں
کہ جب اس کی آنکھوں کو نم دیکھتے ہیں

ترا غم میسر ہے قسمت سے جن کو
زمیں پر بہارِ ارم دیکھتے ہیں

قمر دل مچل اُٹھتا ہے مے کشی پر
تصور میں جب جامِ جم دیکھتے ہیں

●●●

ڈاکٹر محمد الیاس تائبؔ خیرآبادی

خیرآباد، سیتاپور- Mob.9369404467

امانت اللہ اسیرؔ کی شاعری

بہت کم شعراء ہوں گے جنھیں ایک ہی وقت میں اردو ادب کی تمام اصنافِ سخن میں شعر گوئی کا ملکہ حاصل ہو۔ استاد امانت اللہ اسیرؔ ان چند شعرا میں تھے جن کو غزل، نظم، رباعی، قطعہ، مرثیہ، حمد، نعت، منقبت، مناجات، سہرا، رخصتی اور تاریخ گوئی میں مہارت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ انگریزی نظموں کے منظوم تراجم بھی ہمیں ان کے مجموعۂ کلام ''صدائے عرش گیر'' میں دیکھنے کو ملتے ہیں، یہ جہاں ان کے قادرالکلام شاعر ہونے کا بیّن ثبوت ہے وہیں ان کے تبحر علم وفن اور ہر صنفِ سخن پر ان کی مساویانہ دسترس کا بھی گواہ ہے۔

بقول صابر سنبھلی ''صدائے عرش گیر'' ایسا شعری مجموعہ ہے جو حسن صورت اور حسنِ سیرت دونوں حیثیتوں سے قابل تعریف ہے ایسا مجموعہ ایک مدت کے بعد سامنے آیا، شاعر کی پختہ کلامی میں شک نہیں اس کی غزلوں کی فن کاری اور سارے مجموعہ کی پختگی سے متاثر ہوکر میں اسیرؔ صاحب کو قادرالکلام شاعر تسلیم کرتا ہوں۔

ہر صنفِ سخن میں مشق ہونا ایک بات ہے لیکن مخصوص صنف کے فنّی تقاضوں کو پورا کرنا ان کے ممتاز اور باکمال ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں ایسے شعراء بھی شاذ ونادر ملیں گے، جنھوں نے عروض وقواعد کی مکمل پابندی کرتے ہوئے شیریں کلامی، غنائیت اور فنّی خلوص کا لحاظ رکھا ہو اسی لئے ایک وقت میں استاد ہونا اور شاعر بھی ہونا بہت مشکل ہے عروض وقواعد الگ کے میدان میں فنّی کسرت کرنا اور شاعری کرنا دونوں الگ الگ باتیں ہیں، بحور واوزان کی سختی سے پابندی کرنے والے ناسخؔ کی طرح بے مثل استاد تو بن جاتے ہیں لیکن شاعر ہوتے ہوتے رہ جاتے ہیں۔

اسیرؔ صاحب نے تمام تر عروضی شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے سب ہی اصنافِ سخن میں نہ صرف یہ کہ طبع آزمائی کی ہے بلکہ شعری جمال اور فنّی کمال کا مکمل خیال بھی رکھا ہے۔ کوئی بھی ادب وقت کے تقاضوں سے بے نیاز، عصری آگہی سے بیگانہ اور جدلیاتی، تاریخی اور سماجی تغیر وتبدل سے منھ نہیں موڑ سکتا، اسیرؔ کی شاعری جو گذشتہ سات دہائیوں کو محیط ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات واقدار سے نہ صرف یہ کہ روشناس ہے بلکہ اس کو انگیز کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے باوجود اس کے کہ زندگی کی تلخیوں نے ان کی فطری ترش مزاجی میں بے حد کرواہٹ پیدا کر دی ہے پھر بھی زندگی کو انہوں نے محبوب کی طرح چاہا اور جیا یہاں تک کہ زندگی اور خود کے درمیان معرکہ آرائی میں فتح انھیں کو ملی، تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں کڑواہٹ کا کہیں احساس نہیں ہوتا۔ عام طور پر ادبِ لطیف کے علمبردار اختر شیرانی کی طرح تخیّل پرستی کے قائل اور حقائق زندگی سے فراریت کے حامی نظر آتے ہیں وہ ادب میں زندگی کی تخیّلی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں کہ عقل وادراک اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ یہاں زندگی سے فراریت، کم ہمتی اور جرأتِ مردانہ کی کمی کا احساس ہوتا ہے لیکن

اسیرؔ صاحب کے یہاں ایسا کچھ نظر نہیں آتا، شجاعت و بیباکی اور زندگی سے آنکھیں ملانے کی جرأت ان کی غزلیہ شاعری میں بالعموم اور نظمیہ شاعری اور قطعات میں خاص طور پر دکھائی دیتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

اگر رہوں تو میں عالی وقار بن کے رہوں
فقط سوار نہیں شہ سوار بن کے رہوں
میں نظم و نثر کا پروردگار بن کے رہوں
جہانِ علم کا خدمت گزار بن کے رہوں

مرے چراغ سے سب فیض علم وفن پائیں
مرے چراغ سے لاکھوں چراغ جل جائیں

سخن وری میں گزاری تمام شب ہم نے
غمِ فراق کو دلہن بنا کے چھوڑ دیا

طوفاں سہی خدا کے سہارے کہاں نہیں
عزم ویقیں جو ہوں تو کنارے کہاں نہیں

دل کو ہے دل نواز نظاروں کی جستجو
ورنہ نظر نواز نظارے کہاں نہیں

ملنے نہ پائیں جرأتِ پرواز کے قدم
چاہے تمہاری قوت پرواز کانپ اٹھے

پہونچا دیا ہے مجھ کو اناالحق نے دار پر
نکلی زباں سے بات تو سر تک پہونچ گئی

مرے ہاتھوں میں ظالم اپنا خالی ہاتھ ہی دیدے
تہی دستی میں جینے کا سہارا یہ بھی ہوتا ہے

بجز دید کوئی تمنا نہیں ہے
نظاروں سے بھر دو نگاہوں کے دامن

غلط ہے سر جھکے دنیائے رنگ و بو کے لئے
ضمیر بیچ دوں کیا اپنی آرزو کے لئے

نہ چھیڑ بہرِ خدا ناتواں سمجھ کے مجھے
میں اپنی جان بھی دے دوں گا آبرو کے لئے

اسیرؔ صاحب کی نظموں میں رومانیت میں انقلاب کے خواب، سازِ عشق کی لے پر آزادیٔ وطن کے لئے مر مٹنے کا جذبہ سر چڑھ کر بولتا ہے معشوق اور اس کی محبت زندگی میں رنگ بھرنے کی حیثیت تو رکھتی ہے ساتھ ہی حیات کے مختلف پہلوؤں کے لئے ولولہ اور جوش کا سبب بھی بن سکتی ہے لیکن زندگی جیسی عظیم اور انمول شے حسن وعشق کے لئے قربان نہیں کی جاسکتی۔ اسیرؔ صاحب کے کلام میں مجازؔ کی طرح رومانیت میں انقلاب ضرور پوشیدہ ہے لیکن ان کی طرح للکار نہیں، نہ ہی فیضؔ کی سی دھیمی اور مدھم لے نہ جوشؔ کی طرح انقلاب زندہ باد کے نعرے۔ اسیرؔ صاحب کے کلام میں الفاظ کی شان وشوکت ہے مگر جوشؔ کی طرح خطیبانہ رنگ وآہنگ نہیں، مجازؔ کی طرح عشق کے سوز وساز اور درد وکرب کو سینے سے لگا کر مر جانے کا ولولہ بھی نہیں ہے بلکہ اس درد وکرب اور سوز وساز کا احساس رکھتے ہوئے زندہ رہنے کا حوصلہ اور جوش ہے، باوجود اس کے ان کے عشق میں والہانہ پن اور خود سپردگی ہے لیکن وہ حسن وعشق سے زیادہ زندگی کے تقاضوں اور عصری ضرورتوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ وطن عزیز کی خاطر جان کی قربانی دینا ارمانوں بھرے رومان کا خون کرنا ان کا جذباتی دعویٰ نہیں، بلکہ سوچا سمجھا فیصلہ ہے زندگی کے عظیم مقصد کے حصول کے لئے انہیں کارواں بنانے کی ضرورت نہیں، وہ تنِ تنہا شمشیرِ برہنہ کے ساتھ معرکہ آرائی میں اتر آتے ہیں، انہیں سماجی حقائق ومعاشرتی آلام کا گہرا احساس ہے، جسے وہ اشعار میں بیان کرتے ہیں ۔

مٹ گیا دل سے محبت کا الم آخر کار
بس گیا روح میں انسان کا غم آخر کار

تم کو دیکھوں کہ نصیبوں کی سیاہی دیکھوں
تم کو دیکھوں کہ عذاباتِ الٰہی دیکھوں
تم کو دیکھوں کہ جفاکاریٔ شاہی دیکھوں
تم کو دیکھوں کہ غریبوں کی تباہی دیکھوں
غم اگر زہر ہے اس زہر کو پینے دو مجھے
تم چلی جاؤ بس اب چین سے جینے دو مجھے
مزدور کا جو خون پئیں ان کو مٹا دوں
جو ان کو جلاتے ہیں میں گھر ان کا جلا دوں
ٹھوکر سے جہاں مکر کے بندوں کا اڑا دوں
سرمایہ پرستی کو تہِ خاک سلا دوں
شمشیر بکف آؤں گا میداں میں نکل کر
دم لوں گا میں مزدور کی تقدیر بدل کر

ترقی پسندی سے جڑے ہوئے شعراء کے یہاں خطیبانہ کرختگی، زبان وبیان کی گھن گرج ملتی ہے، اسیؔر صاحب کی شاعری میں موضوعی اعتبار سے بھلے ہی تنوع نہ ہو لیکن ترقی پسندی سے متعلق مختصر موضوعات میں جامعیت اور گہرائی کا احساس ہوتا ہے، ان کی نظمیں، زہرہ، عذرا، شہناز اور ناہید میں انسانی درد کے علاوہ وطن دوستی اور جدوجہد آزادی کا جذبہ ڈرامائی انداز میں ملتا ہے، ایک رومانی کیفیت کا دلکش و دلنشیں انداز سے گریز اختیار کرتے ہوئے اصل موضوع کی جانب آنا کوئی نئی بات نہیں، ان کے یہاں ہیئتی یا تکنیکی تجربات نہیں بلکہ مشروط اور پابند نظموں میں موضوعی تجربات ہیں، نظموں میں ڈرامائی عنصر اقبالؔ کے ذریعہ پہلے ہی داخل ہو چکا تھا لیکن نظموں میں رومانی، بہاریہ، اور کیف و مستی میں ڈوبی ہوئی فضا سے اچانک گریز اختیار کرتے ہوئے اصل موضوع کی طرف مڑنا ان کا فنی تجربہ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ نظم کے لب ولہجہ میں تشبیب سے گریز کرتے ہوئے مدعا کی طرف آنا قصیدہ کی فارم کی صحت مندو توانا شکل ہے۔

ہائے اس غم سے فراغت نہ تمہیں ہے نہ مجھے
عیش و عشرت کی اجازت نہ تمہیں ہے نہ مجھے
بحث و تکرار کی فرصت نہ تمہیں ہے نہ مجھے
لب ہلانے کی ضرورت نہ تمہیں ہے نہ مجھے
آج کل ذہن ہے ماؤف پریشاں ہے دماغ
کچھ دنوں کے لئے گل کردو محبت کا چراغ

....

چین کی جنگ میں ناموس وطن کی خاطر
تم مرے خون کی مہندی جو لگا سکتی ہو
اپنے ہتھیار اٹھا لو مرے ہمراہ چلو
ورنہ جی چاہے جہاں شوق سے جا سکتی ہو
اب تو مل کر ہی بدلنا ہے زمانہ کا چلن
باندھ دو اپنے دوپٹے کا مرے سر سے کفن

ان کی غزلیہ شاعری میں نغمگی، شیرینی اور گھلاوٹ مجازؔ کی یاد دلاتی ہے ان کے یہاں غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کے باوجود ناہمواری کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ہم آہنگی، نرمی اور دلنشینی ملتی ہے۔ کامیاب اور پُر اثر شاعری کے لئے مثبت عناصر میں فن اور شخصیت میں ہم آہنگی اظہار کا حسن معنویت وغیرہ کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ اظہار کے حسن کے لئے رمز وایماء کنایہ واشارہ نادر تشبیہات واستعارات نہ صرف ان کی غزلیہ شاعری کو اعتبار بخشتی ہیں بلکہ ان کی نظموں میں بھی یہ خوبیاں موجود ہیں اس طرح، معنوی اور موضوعی اعتبار سے اپنے نجی تجربات اور عصریت سے جڑ کر ان کی نظمیہ شاعری بڑی بن جاتی ہے۔ ادب وشاعری کے لئے جو تخلیقی ریاض، خلّاقانہ ذہنیت اور فنی خلوص چاہئے وہ اسیؔر کے کلام سے ظاہر ہے، فن اور شخصیت میں ہم آہنگی کا مفروضہ غلط

ثابت ہو چکا ہے ادب میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن کے یہاں فن اور شخصیت میں تضادات ملتے ہیں اور یہ تضاد کسی حد تک اسیؔر صاحب کے یہاں بھی موجود ہے۔

اسیؔر کے یہاں زندگی اور ادب کا واضح تصور ملتا ہے ان کے یہاں شعور زندگی کے ساتھ ساتھ شعورِ فن بھی ہے، انہوں نے اپنی شاعری میں مسائل اٹھا کر چھوڑ نہیں دیئے بلکہ علم وعقل کی روشنی میں ان کا حل بھی پیش کیا ہے اس لئے کلام میں نہ دھندھلا پن ہے نہ کوئی اشکال اور ابہام ملتا ہے، نہ ہی فرسودگی اور سوقیانہ انداز دکھائی دیتا ہے، حسن اور جسم حسن کی دلکشی و مستی کا پاکیزہ اظہار وجدانی کیفیت پیدا کرتا ہے، جنسِ لطیف، اس کی نفسیات اور نازک مرحلوں میں رمزیاتی اور کنائی انداز ملتا ہے۔

کسی ستم گر نے ہاتھ اٹھا کر جو آج انگڑائی لی ادا سے
شباب سر چڑھ کے خود ہی بولا میں بر سر اقتدار آیا
دفعتہً عرض تمنا پہ تری انگڑائی
فطرتاً عقدۂ نازک کا یہ حل کیا کہنا

عام طور پر غنائی شعراء اپنے محدود ذاتی تجربات کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن اسیؔر صاحب کی شاعری میں غنائیت، گہرائی، وسعت، آفاقیت اور مستقبل سجانے اور سنوارنے کی امنگ ملتی ہے ان کے یہاں تھکن نہیں مستی ہے، زندگی سے پیار ہے جینے کا حوصلہ ہے، ان کے یہاں یاسیت اور قنوطیت کا گزر نہیں ہے اسی لئے ان کے کلام میں حالتِ نزع، مرگ، پسِ مرگ قبر وغیرہ کا فرسودانہ اندازِ فغاں دور دور تک نظر نہیں آتا۔ ان کی نظموں میں غنائیت، رومانیت اور سیاست وآلامِ زیست کا حسین امتزاج ملتا ہے وہ انقلاب کے لئے نعرے نہیں لگاتے نہ ہی گرجتے ہیں بل کہ انقلاب میں بھی ایک رومانی کیفیت ووارفتگی ہے جس میں حوصلہ ہے ولولہ ہے ان کی نظموں میں ایک طربناک لطف ولذت کا احساس ہوتا ہے۔

میں وہ شاعر ہوں کہ جو سوز بھی ہے ساز بھی ہے
اک پرستارِ محبت بھی ہے جانباز بھی ہے
جس کی لے میں ہیں محبت کے سریلے نغمے
جس کے نغمات میں ہر دور کی آواز بھی ہے

اسیؔر صاحب ترقی پسند تحریک سے باضابطہ وابستہ نہیں ہوئے لیکن تحریک کا اثر قبول کیا مگر انہوں نے مجبوری اور اضطراری حالت میں بھی تخریبی انداز اختیار نہیں کیا، ان کے یہاں تعمیر، انقلاب اور اک نئی دنیا سجانے کے خواب نظر آتے ہیں انہوں نے ہندوستانیوں کو احساس کمتری اور بزدلی کے دلدل سے نکال کر جد وجہد آزادی کے لئے میدانِ عمل میں اتارا۔ ان کے یہاں انسانیت کا درد ہے انہوں نے سرمایہ داری، ظلم وجبر استبداد وتشدد کے خلاف بھرپور صدائے احتجاج بلند کی، ''مزدور''، ''پندرہ اگست ۱۹۴۷ء''، ''دو اکتوبر''، ''کارنامۂ تلک''، ''دل کی آواز'' جیسی نظموں میں مظلوم اور مفلس انسانوں کا درد ہے، مزدوروں سے نہ صرف یہ کہ اظہارِ ہمدردی ہے بلکہ ان کے دکھ درد کی سرگزشت بیان کی ہے۔

اسیؔر طبعاً غنائی شاعر ہے اس کے لب ولہجہ میں قنوطیت کے بجائے رجائیت ملتی ہے مجازؔ کی طرح موت کی تمنا، مایوسی کا اظہار نہیں ملتا بلکہ زندہ رہنے کا نشہ ہے، زندگی کی تعمیر اور ارتقاء کا نظریہ ملتا ہے ان کے یہاں الفاظ میں ندرت، طرزِ ادا میں دلکشی، اسلوب میں روانی اور شگفتگی ہے، ان کا عشق سماوی وروحانی نہیں بلکہ ارضی اور حقیقی ہے، مگر جسمانی لذت پسندی کہیں نہیں ملتی۔ ان کے یہاں عورت حسن وجمال کے ساتھ وارد ہوتی ہے، ان کی پیکر تراشی، تعیش اور لذّت سے آشنا نہیں کرتی، ذوقِ حسن اور ایک شائستہ جمال کی کیفیت سے روشناس کراتی ہے، انہوں نے عورت کے لب ورخسار، زلف وقامت کا بیان جدید تشبیہات واستعارات کے ذریعہ کیا ہے، ان کے یہاں فرسودہ تراکیب یا

بوجھل اصطلاحات کی کہیں اطلاع نہیں ملتی ۔

محنت اگر کرتا نہیں کیا ہاتھ تیرے آئے گا
اپنا پسینہ پہلے تو برسائے تب برسے گا ہُن

جُرأت نے جگہ پائی ہے تلوار کے اوپر
جرأت کا پتہ چلتا ہے تلوار کے نیچے

سائے کی طلب آپ کو اوروں کو پھلوں کی
لگ جائیں نہ پتھر کہیں اشجار کے نیچے

ترے آستاں سے آگے جو کوئی مقام ہوتا
تو یہیں ٹھہر نہ جاتے یہ قدم ضرور چلتے

زلف شب رنگ ہے یوں عارضِ تاباں پہ اسیر
رات کے ہاتھوں میں دامانِ سحر ہو جیسے

صبیح رخ پر ملیح زلفیں متین دل میں حسین ارادے
کمالِ شعر و شباب بن کر وہ حاصلِ انتظار آیا

یہ چند اشعار بطورِ مثال پیش کئے گئے ہیں جن میں خیال کی ندرت، بلیغ تشبیہات واستعارات حسن وجمال کا شگفتہ بیان اورفنی حسن بدرجۂ کمال موجود ہے۔

پروفیسر ایم۔اے علوی کی رائے: ''اسیر صاحب کی غزلیں شعریت، غنائیت، موسیقیت، شیرینی لطافت اور دلکشی سے لبریز ہیں، سبک نرم اور نازک الفاظ جذبات میں ڈوبا ہوا تفکر وتعمق نہایت قابلِ تعریف ہے، ان کی غزلیں کیف واثر میں ڈوبی ہوئی ہیں، ان کی نظموں میں جوشؔ جیسی گھن گرج بھی موجود ہے اور مجازؔ ساحرؔ اور اختر شیرانیؔ کی نظموں کی طرح رومان اور زندگی کے مسائل کا حسین امتزاج بھی ملتا ہے۔''

پروفیسر ایم۔اے علوی نے مزید فرمایا: ''کہ اسیرؔ صاحب کی نظموں کا انداز مندرجہ بالا شعراء سے ملتا ضرور ہے لیکن ان کی الگ چھاپ اور انفرادیت صاف طور پر نظر آتی ہے۔''

اسیرؔ صاحب کی شاعری میں فنی حسن درجۂ کمال تک ہے ان کی زبان ڈھلی منجھی خیال میں پاکیزگی لب ولہجہ میں گھلاوٹ اور شیرینی ہے، ان کا کلام فنی نقائص واسقام سے پاک ہے اسی لئے اپنے معاصرین شعراء میں وہ منفرد اور ممتاز نظر آتے ہیں، وہ اپنے فنی کمال کی وجہ سے ہر دور میں پہچانے جائیں گے۔

اسیرؔ علیگڑھی کی غزلیات ومنظومات ہمیں وضاحت اور تفصیل کا احساس کراتی ہیں نظم گوئی میں اس کی گنجائش ہے لیکن غزل کا دامن بڑا نازک ہے اس کی کامیابی گہرائی ایجاز واختصار اور جامعیت میں پوشیدہ ہے۔ وہ صرف ہمارے وجدان اور احساس کو ہی متاثر نہیں کرتی ہمارے شعور وادراک کو بھی متحرک کرتی ہے، اسیرؔ کے کلام میں جدید رنگ وآہنگ کے اشعار بھی بکثرت ملتے ہیں ۔

میری نیند اڑا دیتی ہیں
تیری سونے والی آنکھیں

میں نے پکڑے اس کے پاؤں
تب بھی نہ چھوڑا میرا ہاتھ

نظر کے پاؤں تھک کر رہ گئے ہیں
کہاں مستور ہیں جلوے تمہارے

جلوہ ہے جلوہ جلوے پہ کیا اختیار ہے
برق ِجمال طور ابھی ہے ابھی نہیں

آنکھوں میں آنکھیں ڈال دے پیمانہ توڑ دے
یہ بھی ہے کیا سرور ابھی ہے ابھی نہیں

اسیرؔ کی شاعری میں انسانیت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے وہ آلام روزگار میں اپنا نجی غم بھول جاتے ہیں، ان کی غزلیات میں نجی درد وکسک کا احساس کم ہی ہوتا ہے اسی لئے دل سے پھوٹنے والے اس الم میں شدت اور دیرپا تاثیر نظر نہیں آتی۔

ہائے زہرہ میں پریشاں ہوں تمھیں کیا معلوم
کس لئے تم سے گریزاں ہوں تمھیں کیا معلوم
چاک دل چاک گریباں ہوں تمھیں کیا معلوم
میں اسیرِ غم انساں ہوں تمھیں کیا معلوم

جذبۂ عشق نہیں حسن کا احساس نہیں
دردِانساں کے سوا کچھ بھی مرے پاس نہیں

ترقی پسند تحریک کے رجحانات کے حامی ہونے کے باوجود انہوں نے اردو کلاسیکی سے اپنا رشتہ ہموار رکھا۔ غزل گو شعراء کا تصوف پسندیدہ موضوع رہا ہے دردؔ اور اصغرؔ کی اس روایت کو اسیرؔ نے بھی برقرار رکھا ہے ۔

اُس شمعِ حقیقت کی ضیاء ہوگئی محفوظ
واللہ مرا قلب ہے قندیل کی تمثیل
یہ نقش پا جگہ جگہ زمین و آسماں پہ ہیں
جو بس میں ہو تو ہر طبق الٹ پلٹ کے دیکھ لو

بحر ہزج مثمن مقبوض میں لکھی گئی پوری غزل معرفتِ الٰہی سے بھر پور ہے اسی بحر میں ایک اور غزل تصوف کی بہترین مثال ہے جو مسئلہ وحدۃ الوجود کے تناظر میں لکھی گئی ہے ۔

کرن ہوں میں نہ دھوپ ہوں تمام آفتاب ہوں
شعور ہو تو دیکھ لو کھلی ہوئی کتاب ہوں
میں جزو کل کا مسئلہ میں امرِ کن کا فیصلہ
جو انتخاب حسن ہے وہ حسنِ انتخاب ہوں

اسیرؔ صاحب نے غزل کی ہیئت میں بھی تجربات کئے ہیں چنانچہ ایک غزل میں مطلع ہی مطلع ہیں جس کے مصاریع ثانی ایک قافیہ کی قید کے ساتھ جس میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ قافیہ وہی ہو جو ردیف ہے ۔

شرما گئی ہے دیکھ کے تیری نظر نظر
دراصل اب تو ہوگئی میری نظر نظر
تخصیص کر سکے گی فقط دیدہ ور نظر
سر سر ہے جان جان ہے دل دل نظر نظر

ایک غزل ذو قافیتین وذوردیفین ہے جس میں بدھ ازم کے فلسفہ پر تنقید کی گئی ہے ۔

متلاشیِ رہ آگہی یہاں راحتوں کا گزر نہیں
ترا مدعا ہے اگر یہی تو شعورِ ذات میں مات ہے
میں ترا پیام لئے لئے شب و روز پہنچا کہاں کہاں
کبھی دن ہے لات ومنات میں کبھی سومنات میں رات ہے

ایک اور نہایت خوبصورت قابلِ ذکر غزل جس کے اندر قطعہ بند شعر میں ردیف کے لہجہ کی تبدیلی سے متضاد معنیٰ برآمد کئے گئے ہیں۔

کیسے کیسے انہیں بخشے ہوئے دنیا کے خطاب
جانِ دل جانِ جہاں جانِ غزل کیا کہنا
وہ تو ہیں جانِ مشیّت انہیں توبہ توبہ
جانِ دل جانِ جہاں جانِ غزل کیا کہنا

ایک غزل کے مصاریع ثانی صرف قافیہ اور ردیف پر مشتمل ہیں ایک جگہ لفظ ''یہ'' چھوڑ کر اور کوئی بھی لفظ قافیہ اور ردیف کے علاوہ نہیں ہے ۔

ترے دستِ حسیں کو شاذ و نادر تھام لیتا ہوں
خطا ہونے کو ہوتی ہے مگر ہر دم نہیں ہوتی
لب دِم ہو کوئی تب وہ لبِ اعجاز ہلتے ہیں
دعا ہونے کو ہوتی ہے مگر ہر دم نہیں ہوتی

□□□

R. No. 25039/72
U.P. Urdu Akademi
Khabarnama
उ.प्र. उर्दू अकादमी ख़बरनामा
اُتر پردیش اُردو اکادمی خبرنامہ
Vol. No. 51 | April 2023 | Issue No. 10

اُتر پردیش اُردو اکادمی کی نئی کتابیں

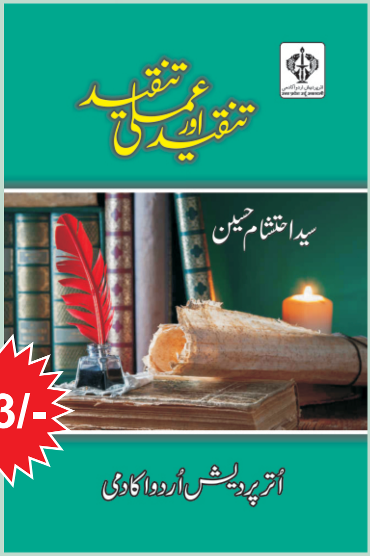

183/-

475/-

196/-

183/-